شعر و شعور

ب
حفیظ میرٹھی

۱۹۷۰

شعر و شعور

حفیظ میرٹھی

مکتبہ دوام۔ ٹانڈہ (فیض آباد) یوپی

بار اول ۱۰۰۰

قیمت : ۳ روپے

طابع وناشر :

مکتبہ دوام

ٹانڈہ (فیض آباد)

مطبع :

نامی پریس لکھنؤ

وقت اشاعت :

مئی ۱۹۷۰ء

مطبع :

اس مجموعہ کی جمع وترتیب کے سلسلے میں

ادارۂ دوام

جناب عزیز بگھروی کا شکرگذار ہے

ادارۂ ادبِ اسلامی ہند

کی

چوتھی پیش کش

پیش لفظ

غزل اور مطالعۂ غزل کے سلسلے میں میں کچھ دنوں سے ایک خاص عقیدے کی پرورش کر رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ غالبؔ کی صد سالہ تقریبات کے ضمن میں غالبؔ شناسی اور غالب پسندی کا جو غلغلہ بلند ہوا اس کے نفسیاتی اثرات کو بھی اس میں کچھ دخل ہو' لیکن بہر حال میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ پچھلے سو سال کی اردو غزل کو اگر صحیح تناظر میں دیکھنا ہو تو غالبؔ اور کلامِ غالبؔ ہی کے زاویے سے دیکھنا ہو گا۔ کسی دوسرے مقام پر میں نے اس تھیسس کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھا ہے یہاں صرف چند اشاروں پر اکتفا کروں گا۔ میرا کہنا یہ ہے کہ اردو کی روایتی غزل اپنی تمام کلاسیکی آن بان کے ساتھ غالبؔ کی شاعری کے روپ میں اپنے انتہائی نقطۂ عروج کو پہونچ گئی' اور اس کے بعد واقعی خطوط پر اس کے مزید ارتقا کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ یوں گویا غالبؔ نے اردو کی کلاسیکی غزل کا خاتمہ کر دیا۔ اور نتیجہ اس کا اس صورت میں سامنے آیا کہ وہ غزل جو کم و بیش دو سو سال تک ایک حسین شاہراہ پر قابلِ تعریف استقامت اور یک سوئی کے ساتھ اپنا سفر جاری کیے رہی اور ارتقائی منازل کو بے تکان طے کرتی رہی تھی غالبؔ کے بعد اس شاہراہ سے ہٹ کر چھوٹی موٹی پگڈنڈیوں پر جا پڑی اور جس طرح ایک شاندار و پر کیف دریا اپنے راستے میں کسی کوہِ گراں کو حائل پا کر متفرق دھاروں اور تنک آب ندیوں میں منقسم ہو کر رہ جائے اسی طرح غزل کا بنیادی کلاسیکی

اسلوب متفرق ضمنی اسلوبوں میں بٹ کر رہ گیا۔ تقسیم و تفریق کا یہ سلسلہ آج تک جاری ہے بلکہ موجودہ دور میں تو اس کے اندر ایک غیر معمولی شدت پیدا ہو گئی ہے۔ شکست و ریخت، ترمیم و تنسیخ اور تخریب و انہدام کے سوا غزل کے میدان میں آج کچھ نظر نہیں آتا۔ ہر طرف انتشار کا دور دورہ ہے ایک بحران کا عالم ہے۔ اور کوئی مثبت وقیع اور بھاری بھر کم غزلیہ اسلوب ابھر کر سامنے نہیں آرہا ہے۔ اس تمام انتشار و بحران کو میری ناچیز رائے میں غالب اور اسکی ظالمانہ عظمت سے پیدا ہونے والے اجتماعی اثرات کی روشنی ہی میں بہترین طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔

غزل تو ہماری شاعری کی سب سے مستحکم صنف ہے ـــ اس کی تاریخ صدیوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی پشت پر صدہا فن کاروں کی صناعانہ فتوحات اور گراں قدر تخلیقات کے طویل سلسلے ہیں جو ماضی میں دور تک چلے گئے ہیں۔ وہ اپنے بنیادی رمزیاتی اسلوب کی مداومت کے باوجود ہر دور میں، بلکہ ہر بڑے شاعر کے کلام میں ایک نئی آن بان کے ساتھ جلوہ گر ہوتی رہی ہے۔ بیان، اظہار، اور ابلاغ و ترسیل کی لاکھوں نزاکتوں اور بے شمار لطافتوں سے اس کا دامن لبریز ہے۔ افکار و تاملات، احساسات و انفعالات، حقائق و لبصائر اور اسالیب و صور کے اس حیرت انگیز طلسم خانے کا جواب فارسی اور اردو کے علاوہ دنیا کی شاید ہی کوئی دوسری زبان اور شاید ہی کوئی دوسرا ادب ہو جو پیش کرنے کی جرات کر سکے ـــــــــــــ پھر ایسی مستحکم صنف سخن کا اپنے محور سے ہٹ جانا، ادھر ادھر بھٹکنا اور ٹامک ٹوئیاں مارنا کوئی ایسا سانحہ نہیں جس کو ہم وقت اور زمانے کے تغیرات سے منسوب کر کے مطمئن ہو جائیں۔ وقت اور زمانے کے تغیرات کوئی نئی چیز نہیں۔ ان سے تو غزل کو ہمیشہ ہی نصرت ہی اور غزل کا بنیادی اسلوب ان کی جا پر کبھی متزلزل نہیں ہوا۔ بات وہی ہے جو میں نے اوپر کہی۔ غالب نے روایتی غزل پر مہر اتمام ثبت کر دی، اور بعد میں آنے والے شعراء کے لیے یہ راستہ مسدود ہو گیا۔ چنانچہ داغ، امیر، جلال اور ان کے ہم نواؤں کا دور غزل کے ضعفِ پیری کا دور تھا، اور حسرت، اصغر، فانی اور جگر کا زمانہ اس مریضِ جاں بلب کا آخری سنبھالا، جس کے بعد یہ شمع ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔

پھر جب میں یہ کہتا ہوں کہ غالب نے اردو کی کلاسیکی غزل کو نصف النہار پر پہنچا کر اس کے مزید نشوونما کے امکانات کو ختم کر دیا، اور آخری ردِ عمل اس کا یہ تھا کہ صنفِ غزل ہی کا خاتمہ ہو گیا، تو دراصل میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ سراج دو ولی اور میر و سودا سے لے کر غالب تک غزل جس روایتی بنیادی، اساسی اور معلوم و معروف اسلوب کے سہارے آگے بڑھتی رہی تھی اس اسلوب کا خاتمہ ہو گیا اور اس کا سیدھا سادہ سا مطلب یہ نکلتا ہے کہ غزل کا مخصوص رمزیاتی پیرایۂ بیان جو معین و مخصوص علائم و اشارات اور تمثیلات و مجازات پر مبنی تھا قصۂ پارینہ بن کر رہ گیا۔ اور وہ تمام فکری و معنوی دلالتیں اور تخیلی و تصوری تلازمات جو ان مخصوص علائم سے وابستہ تھے آئندہ کے لیے بے معرف و ناکارہ ہو کر رہ گئے۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے غزل گو شعراء ان اُگے ہوئے نوالوں کو چباتے رہے اور اس مردہ نظامِ علائم کی ہڈیوں سے اپنی دوکان کو سجانے کی ناکام کوشش میں مصروف رہے۔ پھر اصغر و فانی نے اپنے رچے ہوئے کلاسیکی مزاجِ شعری کی بدولت غزل کی قدیم فرسودہ علامتوں میں ذاتی تخیلی و جمالی تجربات کا رنگ بھرا اور کچھ دنوں ہی کے لئے سہی، ان میں دوبارہ زندگی کی لہر دوڑا دی۔ اس کو غزل کی نشاۃ ثانیہ کا نام دیا گیا، لیکن اس کی حیثیت اس انجکشن سے زیادہ نہیں تھی جو کسی مرنے والے کی موت کو چند ساعتوں کے لئے ملتوی کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا کارنامہ انجام نہیں دے سکتا۔ قصہ مختصر یہ کہ کلاسیکی غزل کے کلاسیکی اسلوب کا قصہ تمام ہوا۔ اس کے انتزاع کا عمل غالب کے بعد شروع ہوا اور حسرت، فانی، اصغر اور جگر کے ساتھ اختتام کو پہنچا!

اب اس کے بعد غزل سراؤں یا غزل سرائی کا حوصلہ رکھنے والوں کے لئے صرف دو راستے باقی رہ جاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ غزل کی روایت کے بنیادی عناصر و اجزا کی طرف سے یکسر منہ موڑ لیں اور روایتی علائم و رموز کو پس پشت ڈال کر شعر کہیں۔ اور دوسرا یہ کہ وہ اپنی خلاقانہ قوت سے کام لے کر قدیم علامتوں کو نئے مطالب اور نئے مفاہیم کے اظہار کا ذریعہ بنائیں، اور اس طور پر غزل کی روایت کی از سرِ نو بحالی اور آبادکاری کا فریضہ انجام دیں۔ یہ کہنے کی ضرورت

نہیں کہ پہلے اکبر نے اور پھر اقبال نے یہی آخرالذکر روش اپنائی تھی اور متداول علامتوں کو نئے معانی پہنا کر اور نئے تصورات سے آباد کر کے اپنا ایک مخصوص اور جداگانہ ایمائی نظام قائم کیا تھا جس کو وہ خود تو بڑی عمدگی اور کامیابی کے ساتھ برت گئے۔ لیکن ان کے بعد ان اکتسابات کو آگے بڑھانے اور ان کو ایک مستقل روایت میں تبدیل کرنے کا عمل جاری نہیں رہ سکا۔ عمرانی و تہذیبی تصورات اور فلسفیانہ افکار کو جمالیاتی تجربات میں ڈھالنا اور ذوقی و وجدانی واردات کا روپ عطا کرنا معمولی فن کاروں کا کام نہیں، اور اکبر و اقبال جیسے فنکار مہیا کرنے کے معاملے میں فطرت بہت بخیل واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ یہ دونوں شاعر اپنے اپنے رنگ کے موجد و خاتم قرار پائے — ظفر علیخاں، محمد علی جوہر کی غزلوں میں بھی کسی حد تک اس روش اور کوشش کا ثبوت ملتا ہے۔ ان دونوں نے بھی غزل کے روایتی علائم کے ذریعے اپنے زمانے کے سیاسی افکار کی ترجمانی کی کوشش کی مسلسل غزلوں کو دیکھئے تو وہاں بھی اس عمل کی کارفرمائی صاف نظر آتی ہے۔ اور پھر جوش ہی کے زمانے میں ترقی پسند شاعروں نے بھی اپنے ترقی پسندانہ فکری میلانات کو جب اور جہاں بھی غزلوں میں پیش کیا اسی تکنیک کا سہارا لیا، جس میں ان کو انفرادی شعراء کی انفرادی صلاحیتوں کے اعتبار سے کبھی کامیابی ہوئی اور کبھی نہیں۔ اس جائزے کی روشنی میں اگر کوئی مثبت نتیجہ نکالا جا سکتا ہے تو یہی کہ موجودہ دور میں غزل کے نظام کو کامیابی کے ساتھ برتنے کی تنہا صورت یہ ہے کہ پرانی علامتوں کو نئی فکری دلالتوں سے وابستہ کیا جائے اور پرانے استعاروں کی مدد سے نئے ذہنی پیکروں کی تخلیق عمل میں لائی جائے۔ اب رہی وہ دوسری روش جس کا بیرسٹرانہ اوپر ذکر کیا یعنی یہ کہ غزل کے سارے روایتی ساز و سامان سے یک قلم منہ موڑ لیا جائے اور عریاں حقائق کو عریاں الفاظ میں براہ راست اور واشگاف طور پر پیش کیا جائے تو اس راستے کی دشواریاں اور قباحتیں ظاہر ہیں۔ اول تو اس روش کی پیروی میں جو غزل سرانجام کی جائے گی وہ محض نام کی غزل ہوگی۔ غزل کی روایت سے اس کا تعلق صرف ظاہری ہیئت کی حد تک ہوگا۔ غزل کی ایمائیت اس میں مفقود ہوگی۔ اس کا اسلوب بنیادی طور پر نظم کا اسلوب ہوگا، اور غزل کا اسلوب کی تصور زائل

سے محروم ہونے کے باعث اس کا دائرہ فکر و تصور بہت محدود ہو گا۔ دوسرے یہ کہ اس غزل میں کامیابی کی ضامن اگر کوئی چیز ہو گی تو وہ حقائق کے ضمن میں شاعر کی شفاف بصیرت کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں ہو سکتی، اور تخلیقی آرٹ کی دنیا میں یہ ایسی کڑی شرط ہے جس کو قدرِ اول کے بھی سب شاعر پورا نہیں کر سکتے۔ حاصل کلام یہ کہ موجودہ دور میں اگر غزل کو باقی رکھا جا سکتا ہے اور آبرومندانہ طور پر باقی رکھا جا سکتا ہے تو اس کی وہ صورت نہ ہو گی جو اس دور میں اکثر غزل نگاروں کے کلام میں نظر آتی ہے کہ انھوں نے غزل کے روایتی اسلوب و طریق کار سے مکمل علیحدگی اختیار کر کے متفرق نظمیہ مضامین کو غزل کے پیرائے میں پیش کرنے کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے اور نتیجہ "غزل نہیں" غزل سے ملتی جلتی کوئی غیر مشخص چیز وجود میں آ رہی ہے اور رسائل کے ذریعے اشاعت پذیر ہو کر شعر و شاعری کی دنیا سے ادبی و فنی حظ کے عنصر کو خارج کر دینے کے سوا کوئی دوسرا کارنامہ انجام دیتی ہوئی نظر نہیں آتی!

میری ان معروضات کی روشنی میں پچھلے سو سال کی اردو غزل کا جائزہ لیا جائے اور اس امر کی تصدیق کی جائے ——— کہ ——— غزل کی بقا کا سامان نہ تو وہ شعرا کر سکے جو کلاسیکی غزل کے مردے کو پیٹتے رہے، اور نہ وہ جنھوں نے غزل کے داخلی و خارجی لوازمات میں صرف اس کی خارجی ہیئت (مطلع، مقطع اور بے ربطیٔ اشعار) کو قابلِ اعتنا سمجھا اور باقی ہر چیز کو متروک یا مردود خیال کیا۔ گویا غزل کی ہڈیاں لے لیں اور گوشت پوست کو بالکل چھوڑ دیا۔ کسی قدر مختلف الفاظ میں اس کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ غزل کو زندہ رکھنے کا اہتمام نہ تو "متعصبین" کر سکے نہ "تحریک پسند"۔ یہ کام تو کچھ انہیں لوگوں سے بن پڑا جن کا رویہ اس خصوص میں معتدلانہ حرکی تھا۔ جنھوں نے کلاسیکی غزل کے بہترین عناصر کو اپنے فن میں جذب کیا، فرسودہ علائم کو چھوڑا، مفید و جاندار علامتوں میں ذاتی تجربات اور عصری میلانات کو سمویا، اور بالآخر غزل کو غزل کی تمام شیرابیانیوں اور دل فریبیوں کے ساتھ قائم رکھتے ہوئے اسے اپنے عہد کی ایک توانا صنفِ شعر بنانے میں کامیاب ہوئے۔

موجودہ دور کے جن غزل نگار شعراء کے کلام میں اس مسلک کی پیروی نظر آتی ہے ان میں جناب حفیظ میرٹھی بھی ہیں جن کی غزلیات کا مجموعہ اس وقت میرے سامنے ہے۔ ان کے کلام پر ایک سرسری اور عمومی نظر ڈالتے ہی مجھے ان خصوصیات و اوصاف کا احساس ہوا جن کا ذکر غزل کے نقادوں اور مجموعہ ہائے غزل کے مقدمہ نگاروں کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ میرا اشارہ ان روایتی شعری محاسن کی طرف ہے جن کو ایک مدت تک غزل کی کسوٹی سمجھا جاتا رہا اور جن کی روشنی میں غزل نگاروں کی قدر و قیمت اور رتبہ و منصب کا تعین ہوتا رہا۔ وہ شعری محاسن ہیں: زبان کی روانی، روزمرہ کی صفائی، مصرعوں کی برجستگی، بندش کی چستی، شستگی و رفتگی، بے ساختگی، شیرینی و فصاحت، بے تکلفی، لطافتِ خیال، حسنِ بیان، نزاکتِ تخیل، صداقتِ جذبات، اثر آفرینی، وجد انگیزی، جدت طرازی وغیرہ۔ میں نے حفیظ صاحب کے کلام میں ان چیزوں میں سے بعض یا اکثر کی موجودگی کو محسوس کیا۔ لیکن میں اتنا کہہ دینا ہی کافی سمجھتا ہوں۔ ان محاسن کا تفصیلی تذکرہ یا حفیظ صاحب کے کلام میں ان کی موجودگی کا ثبوت فراہم کرنے کی کوشش میرے نزدیک ایک بے معنی کوشش ہوگی، اس لئے کہ اگر کسی غزل گو شاعر کا کلام ان اوصاف سے عاری ہو تو اسکو غزل گو ہی کیوں کہا جائے اور اس کے کلام کو غزل کے زمرے میں شمار ہی کیوں کیا جائے؟ مطلب یہ کہ کسی شاعر کو ایک اچھا یا کامیاب یا قابل ذکر غزل گو کہنا ہی یہ معنی رکھتا ہے کہ اس کے کلام میں یہ سب اوصاف کسی نہ کسی حد تک ضرور پائے جاتے ہیں۔ دیکھنے اور جاننے کی چیز یہ ہے کہ شاعر نے فکر کی کس سطح پر شاعری کی ہے؟ اس کے بنیادی فکری میلانات کس نوعیت کے ہیں؟ اسکے افکار کا طول و عرض اور وزن و عمق کیا ہے؟ اس نے وقت کے تقاضوں کو کس حد تک اپنے کلام میں سمویا ہے؟ وہ روحِ عصر کو اپنے دل کی دھڑکن بنانے میں اور عصری شعور کو اپنے لاشعوری نفس کی بیداری کی تقطیر و کشید کے عمل سے گزارنے میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے؟ وہ اپنے عہد کی بصیرتوں کو کس حد تک ذاتی بصیرتوں میں تبدیل کر سکا ہے؟ اپنے دور کی بنیادی قدروں پر اس کی

ذہنی گرفت کا کیا عالم ہے؟ فن کے تقاضوں کی پاس داری اس کے یہاں کتنی ہوئی ہے؟ فن اور مقصد کے امتزاج میں اسکی کامیابی کا اوسط کیا ہے؟ پھر یہ کہ غزل گو کی حیثیت سے غزلیہ اسلوب کی جانب اس کا مجموعی رویہ کس قسم کا ہے؟ اس نے غزل کی روایت کے جاندار عناصر کو جذب کیا ہے یا نہیں؟ غزل کی رمزیت اور ایمائیت کو اس نے کس طور سے برتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

ان سوالوں کے جواب اگر حفیظ صاحب کے کلام میں ڈھونڈے جائیں تو میرے خیال میں یہ جستجو بے نتیجہ ثابت نہیں ہوگی۔ اتنا تو بالکل ظاہر ہے کہ غزل کی طرف حفیظ صاحب کا رویہ ایک تخلیقی اور متحرک رویہ ہے۔ وہ نہ تو پرانے رسم پرست شاعروں کی آواز میں آواز ملا کر محض نقالی کے مرتکب ہوتے ہیں، اور نہ دوسری انتہا پر پہنچ کر صنفِ غزل کو اسکی صنفی آرائش و زیبائش سے عاری کر کے ایک بے جان و بے آب و رنگ ڈھانچہ ہی بنا ڈالنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں غزل کی روایت کی پاسداری بھی ہے اور غزل کے فنی لوازم کا احترام بھی۔ غزل کے رموز و علائم کو انھوں نے سلیقے کے ساتھ برتا ہے۔ بہت سی علامتوں کو ان کے فرسودہ بے جان تعلقات کے ساتھ ترک کر دیا ہے، مفید و کارآمد علامتوں کے امکانات سے فائدہ اٹھایا ہے، اور تقریباً ہر جگہ تخیل اور جذبے کی خلاقانہ قوت سے کام لینے کی کوشش کی ہے۔ خارجی حقائق اور مادی مسائلِ حیات کی طرف سے بھی وہ اپنی آنکھیں بند نہیں کرتے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان کے کلام میں زندگی کے ٹھوس کوائف سے نبرد آزما ہونے کی ایک شدید کوشش نظر آتی ہے۔ اور زیادہ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس جد و جہد میں نازک ترین مقام آتا ہے اور جس سے صحیح سلامت گزرنا کسی ہمالیائی مہم کو سر کرنے سے ہرگز کم نہیں یعنی فنیت اور مقصدیت کا کامیاب امتزاج، تو اس سلسلے میں حفیظ صاحب ہر جگہ نہیں تو اکثر مقامات پر قابلِ تعریف کارکردگی کا ثبوت دیتے ہیں، اور بہر حال مایوس نہیں کرتے۔ اس ضمن میں ان کے کچھ شعر ملاحظہ فرمائیے:۔

بھلی رہنمائیاں ہیں بھلی ناخدائیاں ہیں
وہی رخ قرار پایا جو بتا دیا ہوا نے

رعنائی افکار و خیالات کا مطلب
عریانی افکار و خیالات نہیں ہے

حفیظ میرٹھی کی شاعری

۱۹۳۶ء سے پہلے اردو ادب میں تنظیم اور جماعت نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ادب کا دھارا اپنی فطری رفتار سے بہہ رہا تھا اور بغیر کسی جماعت بندی کے تمام ادب میں ایک سے ایک ذوقی اپنے اپنے صدف میں پل کر سماج کی سطح پر ابھر رہے تھے۔ لیکن ۱۹۳۶ء میں اشتراکیت نوازوں نے ترقی پسندی کے عنوان سے ایک باضابطہ تنظیم بنا ڈالی جو آگے چل کر اتنی ضابطہ بند ہو گئی کہ اس نے ان تمام ادیبوں کو اپنی رکنیت کی فہرست سے خارج کر دیا جن کے بارے میں یہ شبہ کیا گیا کہ وہ اشتراکیت نواز نہیں ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ ترقی پسند ادب کو پروان چڑھانے والوں میں تھے اور ادب میں اپنا ایک ممتاز مقام بنا چکے تھے۔ ادب میں اشتراکی ڈھول ڈھمکے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر ترقی پسند تحریک خود ہی پارہ پارہ ہو گئی اور بہ حیثیت مجموعی اس نے ادب میں بعض مریضانہ رجحانات اور نتیجۃً زوال و انحطاط کے عناصر کو فروغ دیا۔

یہی وہ فضا تھی جس میں ادارۂ ادب اسلامی کی داغ بیل ڈالی گئی جس کا بنیادی مقصد اردو ادب [illegible] توازن و بحال کرنا تھا جسے ہنگامۂ ترقی پسندی نے بری طرح مجروح کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے [illegible] نے ادب میں خالی ترقی پسندی کی بجائے تعمیر پسندی کا نعرہ دیا اور اپنا نظریہ صحت مند [illegible] قدروں کا فروغ قرار دیا۔ ادارۂ ادب اسلامی کا نصب العین دانش وروں کے ایک [illegible] ہوا۔ اس کے تحت مختلف [illegible] کئی اہم تخلیقات پیش کی گئیں اور [illegible] ہوئے چنانچہ اس وقت اسلامی [illegible] وابستہ ادبا و شعرا کا ایک کارواں اردو ادب میں پایا جاتا ہے۔ اس کارواں میں ایک [illegible] دوسری صنفوں سے کچھ زیادہ اور

[illegible] یہ بھی ہندوستان کے اسلام پسند شعرا [illegible] تا ذہنی نظام کے حامل ہیں [illegible]

انھوں نے اپنے فنی ریاض اور شخصی خونِ جگر سے حاصل کیا ہے۔ چنانچہ اس ریاض اور خونِ جگر پر انہیں
ان کے نظریے اور فکر نے ابھارا ہوگا، مگر یہ شاعرانہ صفات انفرادی طور پر حفیظ کے اپنے حاصل کئے
ہوئے ہیں۔ برسات کی بوندیں سطحِ دریا پر بہ طورِ عام گرتی ہیں لیکن موتی بننا اسی قطرے کو نصیب ہوتا ہے
جس کی پرورش کوئی صدف اپنے آغوشِ خاص میں کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ میں حفیظ کو ان شاعروں میں
گنتا ہوں جن کی تربیت خواہ کسی مخصوص حلقے میں ہوئی ہو مگر اپنے حسنِ کلام کی بدولت وہ ادب کے
ایوان میں اپنے لئے ایک جگہ بنا لیتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ بات ایک شاعر کی ممکنہ عظمت کی دلیل
ہوا کرتی ہے کہ جب تک فکرِ خاص عمومِ فن نہ حاصل کرلے فن کے دائرے میں اس کا اعتبار نہیں قائم
ہوتا۔ چنانچہ یہ ایک اہم نکتہ ہے کہ حفیظ کی اسلامی فکر فنِ شاعری کا رسوخ حاصل کر چکی ہے اور اس
طرح وہ تحریکِ اسلامی سے وابستہ ان محدودے چند افراد میں ایک ہیں جو اردو کی مسلمہ ادبی روایت
کے امین بن سکتے ہیں اور تاریخِ ادب میں اپنے آپ کو شخصاً درج کرانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

مطلب یہ کہ شعرا کے ہجوم میں حفیظ کی اپنی آواز پہچانی جا سکتی ہے، خواہ اس کے سُر ابھی کتنے
ہی دھیمے کیوں ہوں، اور وقت گزرنے کے ساتھ یہ زیادہ سے زیادہ گونج دار ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور
پر میں ایک پوری غزل نقل کرتا ہوں، یہ دکھانے کے لئے کہ حفیظ ان قافیہ پیماؤں میں نہیں ہیں
جو بڑی مشکل سے پورے دیوان میں محض ایک دو شعر رواں نکال کر شاعر بن جاتے ہیں، اردو زبان کی
سلاست اور اردو شاعری کے عام اسلوب کی پختگی کے بل پر، بلکہ حفیظ کا اپنا ہی جذبۂ شعری اور اظہارِ
بیان اتنا بالغ و راسخ ہو چکا ہے کہ ایک پوری غزل اور قدرے طویل غزل میں عمومی طور پر یہ جذبۂ
شعری حسنِ تخیل و حسنِ بیان، ہمواری کے ساتھ قائم رہ سکتا ہے۔

چاہے تن من سب جل جائے   سوزِ دروں پر آنچ نہ آئے
شیشہ ٹوٹے غل مچ جائے   دل ٹوٹے آواز نہ آئے
بحرِ محبت توبہ توبہ   تیرا جائے نہ ڈوبا جائے
والے مجبوری انساں   کیا سوچے اور کیا ہو جائے

ہائے وہ نغمہ جس کا مغنی — گاتا جائے روتا جائے
دنیا کا اپنانا ہی کیا — کانٹے اپنے کیوں پرائے
عزت و دولت آنی جانی — ہل مل جائے چھن چھن جائے
ظرف ہے یہ تو اپنا اپنا — کوئی بگاڑے کوئی بنائے
جس کو ہو کہنی دل کی کہانی — سرتاپا دھڑکن بن جائے

کاش ہمارا فرض محبت
عیش محبت پہ چھا جائے

بلاشبہ اس غزل کا غنائی آہنگ جگر مراد آبادی کی یاد دلاتا ہے، لیکن اس میں صرف جگر کی مستی و طرب ناکی نہیں ہے، بلکہ قریب قریب ہر شعر میں کوئی نکتہ فکر ہے۔ اسکے علاوہ لہجے میں ایک ٹھہراؤ اور انداز میں ایک فقیرانہ دردمندی ہے اور یہ سب باتیں اگر جگر اسکول کے خانے میں بھی رکھ کر دیکھا جائے، تو حفیظ کو ایک منفرد شاعر بنانے کا سامان رکھتی ہیں، اس لئے کہ عرفانِ حقیقت سے بہرہ ور رہ جانے کے باوجود جگر کے فن میں ان باتوں کی حیثیت ثانوی ہے، جب کہ حفیظ کا اصل سرمایہ یہی باتیں ہیں۔ حفیظ کی شاعری میں ان باتوں کی ہمہ گیر اہمیت کا اندازہ کرنے کے لئے ذیل میں ان کی دوسری غزلوں کے کچھ منتخب اشعار دیئے جاتے ہیں

حیات و موت کرشمے ہیں انکی شوخی کے — کبھی یہاں سے پکارا کبھی وہاں سے مجھے
اب اپنے جیب و گریباں کا کیا سوال رہا — جنوں کا ہاتھ بٹانے کو خود بہار آئی
اس عزم میں عظمت کی کوئی بات نہیں ہے — جو عزم کہ پروردۂ آفات نہیں ہے
ہاتھ آ گئے جو چاند ستارے تو کیا ہوا — اس آستاں کو خاک کے ذرے کہاں ملے
آئے گا پھر چمن پہ تصرف کا وقت بھی — پہلے قفس کی آب و ہوا دیکھتے چلیں

حفیظ ہی کا ایک مصرعہ مستعار لے کر کہنا چاہیئے کہ ان اشعار میں "شگفتگی بھی ہے

"تاثیر بھی، بصیرت بھی" اور آج کی غزل گوئی میں یہ اوصاف اگر کسی شاعر کو میسر آگئے ہیں
تو اسے یہ حق پہنچتا ہے کہ اپنی تخلیقات کا حجم معتد بہ حد تک بڑھا کر دورِ حاضر کے تغزل کی ایک
مستند آواز بن جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک عرصہ کی زمزمہ پردازی کے بعد بھی حفیظ غالباً اپنی
شاعری کے اس منصب کی طرف بہت کم توجہ کر سکے ہیں کہ اسے موجودہ اردو غزل گوئی میں ایک
قوت بنانے کی ضرورت ہے، تاکہ عدمِ تغزل کی جو لہریں خود غزل کے اندر چلائی جا رہی ہیں انہیں زیادہ
سے زیادہ محدود اور بے اثر بنایا جا سکے اور ان کے مقابلے میں مثبت طور پر تغزل کی فنی روایت
میں زیادہ سے زیادہ توسیع ہوتی رہے۔ میں نے جو ایک پوری غزل پیش کی ہے اس کا موازنہ
اگر فراق کی متغزلانہ طول نویسی سے کیا جائے تو غزل گوئی میں حفیظ کی قوت و صلاحیت کا کچھ اندازہ بہ
آسانی ہو سکتا ہے۔ فراق اپنے کڑھب اسلوب میں جن نفسی کوائف کی آئینہ داری پر اصرار کرتے ہیں حفیظ اُسے
پسند بھی نہ کریں گے، اس لئے کہ دوسروں کی خلوتوں میں جھانکنا اور اپنی خلوتوں کو رسوا کرنا ہر
انسان کے بس کی بات نہیں، مگر طول بیانی کے باوصف ایک تو حفیظ کے ہر شعر میں کچھ گنگناہٹ ہے، دوسرے
ان کے اظہار و بیان میں کہیں ژولیدگی اور کوتاہی نہیں۔ میں نے فراق کے ساتھ یہ موازنہ خاص کر اس
حقیقت کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کیا ہے کہ آج "جدید" غزل گویوں کی ایک کھیپ فراق
زدہ ہے کہ اردو غزل میں عجیب عجیب کونپلیں نکال رہی ہے اور حفیظ کا کنفرنٹیشن اس وقت اسی
کھیپ سے ہے، اور اس کھیپ کے مقابلے میں حفیظ کے فنی اسلحے زیادہ چابک دست اور
کاری ہیں، اگر وہ ان اسلحوں کا بھرپور استعمال کر سکیں۔

اس طرح میرے نزدیک حفیظ میرٹھی کی شاعری کی اہمیت یہ ہے کہ وہ محض کسی
ادارۂ ادب کے شاعر نہیں ہیں، بلکہ ادب کے شاعر ہیں اور اس لحاظ سے انہوں نے اپنے ادارے
کا بھی ادبی اعتبار بڑھایا ہے، اور دوسری طرف اپنے ادبی موقف اور فنی صلاحیت کے سبب
وہ دورِ جدید میں اردو غزل کی روایت کو اپنے عہد کے بعض دوسرے شعرا کے ساتھ مل کر سنبھالنے
اور بڑھانے کا پورا سروسامان رکھتے ہیں۔

عبدالمغنی   ۱۳ر جنوری

نعت

میسر ہو اگر ایمانِ کامل
کہاں کی الجھنیں، کیسے مسائل

نہیں جن میں تمہارا عکس شامل
وہ نقشے ہیں مٹا دینے کے قابل

ثبوتِ عظمتِ انسانیت ہیں
محمد مصطفےٰ انسانِ کامل

تمہارا ہر قدم شمعِ ہدایت
تمہارا نقشِ پا تصویرِ منزل

ہزار آزادیوں سے لاکھ بہتر
تمہارے عشق کے طوق و سلاسل

تمہارے قولِ فیصل سے ہوئی ہے
نمایاں خیر و شر کی حدِّ فاصل

سکوں مجھ کو نہیں درکار آقا
بڑھا دیجے مری بے تابیٔ دل

اجازت ہو تو شاہا! پیش کر دوں
مرے پہلو میں ہے ٹوٹا ہوا دل

حفیظؔ اس عشقِ احمدؐ کی بدولت
مجھے ہے دولتِ کونین حاصل
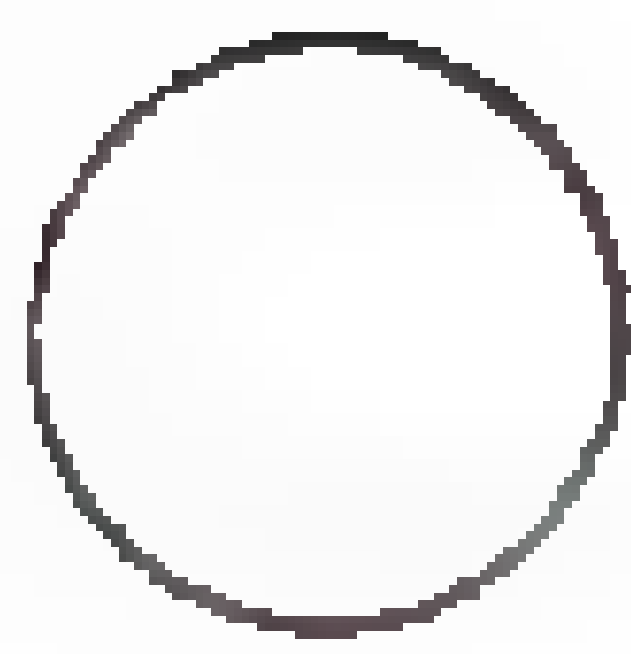
چاہے تن من سب جل جائے
سوزِ دروں پر آنچ نہ آئے

شیشہ ٹوٹے غل مچ جائے
دل ٹوٹے آواز نہ آئے

بحرِ محبت توبہ توبہ!
تیرا جائے نہ ڈوبا جائے

اُف رے مجبوری انساں
کیا سوچے اور کیا ہو جائے

ہائے وہ نغمہ جس کا مغنّی
گاتا جائے روتا جائے

دنیا کا اپنانا ہی کیا!
کانٹے اپنے پھول پرائے

عزّت دولت آنی جانی
مِل مِل جائے چھِن چھِن جائے

ظرف ہے یہ تو اپنا اپنا
کوئی بگاڑے کوئی بنائے

ہر سکوں کی تہ میں سوز آتش فشاں رکھتا ہوں میں
ضبط کا اک رخ نمایاں اک نہاں رکھتا ہوں میں

اے پرستارانِ نغمہ چھوڑ کر تارِ رباب
آج کچھ دکھتی رگوں پر انگلیاں رکھتا ہوں میں

ہائے رے نیرنگیاں ہوں تو چراغ اب بھی مگر
روشنی رکھتا تھا پہلے اب دھواں رکھتا ہوں میں

آج تک گذری اجل کی آرزو میں زندگی
زندگی سے آج بھی دلچسپیاں رکھتا ہوں میں

ہیچ ہیں میری نظر میں آشیان و گلستاں
آدمی ہوں، عزمِ تعمیرِ جہاں رکھتا ہوں میں

مجھ سے کب ہوتی بھلا پابندیِ رسمِ وجود
ان کی دلداری کی خاطر جسم و جاں رکھتا ہوں میں

اب بھی وہ اپنا سمجھ کر مجھ کو اپنا لیں حفیظؔ
کون جانے ورنہ پھر یہ سر کہاں رکھتا ہوں میں

○

نہ خوشبوؤں سے نہ سنجیدگی سے ملتی ہیں
وہ منزلیں جو تری رہبری سے ملتی ہیں

جب اس کے غم کے سوا زیست کچھ نہیں ہوتی
وہ ساعتیں بڑی خوش قسمتی سے ملتی ہیں

نہیں ہے شرط کہ قربت ہو وصل کا حاصل
یہ دوریاں بھی تو وابستگی سے ملتی ہیں

اگرچہ ترکِ تعلق کو ایک عمر ہوئی
وہ نظریں اب بھی اسی دلکشی سے ملتی ہیں

دلِ تباہ! مری بات کا خیال نہ کر!
ملامتیں بھی تو ہمدردی سے ملتی ہیں!

نقابِ حسن کو جلووں سے مختلف نہ سمجھ
نظر کو دید کی راہیں اسی سے ملتی ہیں

جو درد و غم کی طلب ہی سنو کر [illegible]
یہ بخششیں کسی محروم ہی سے ملتی ہیں

O
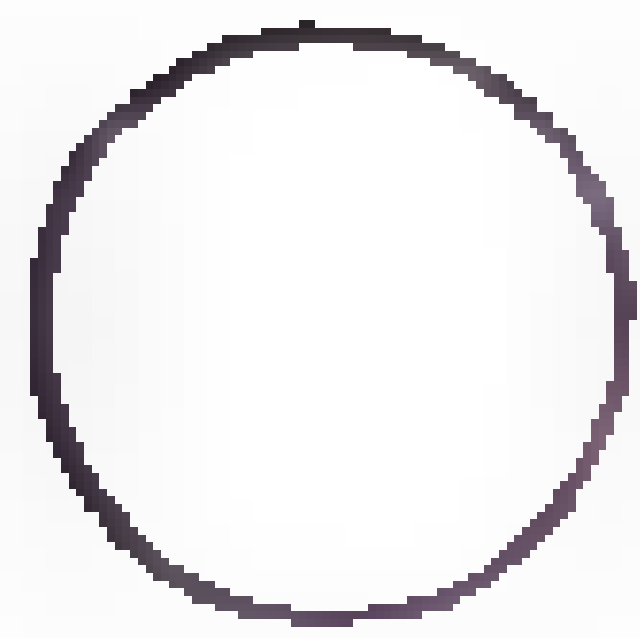
کس کس انداز سے فطرت نے مجھے خوار کیا
کہیں مجبور بنایا کہیں مختار کیا

نیم باز آنکھوں سے یہ کیا نگہ یار کیا
نہ تو معصوم ہی چھوڑا نہ گنہگار کیا

میں تو اس درد کے انجام سے تھرّاتا تھا
جس کے آغاز نے تم کو مرا غمخوار کیا!

ہائے مجبوریِ الفت کہ بایں سوز و گداز
ہم نے ہنس ہنس کے ترے عشق سے انکار کیا

وہی دیوانہ سا برباد سا شاعر سا حفیظؔ
تم نے بھی کس کے لیے دل کو گرانبار کیا
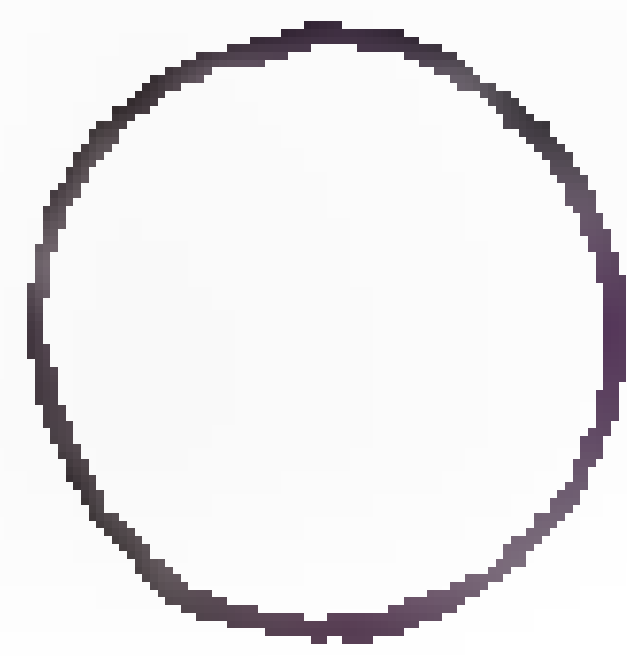
بجھا بجھا غمِ پنہاں سے وہ شباب رہا
اک آفتاب پسِ پردۂ سحاب رہا

دھڑکتے دل کی قسم آپ کے نہ آنے سے
تمام رات ستاروں کو اضطراب رہا

اٹھے جھکے تو کچھ اور ہو گئے بے تاب
ہوا کہ رہی ہمیشہ تہ اضطراب رہا

زباں تو کچھ بھی زباں ہے نگاہ تک نہ اٹھی
مگر وہ شکوہ کہ اس پر بھی کامیاب رہا

شروعِ عشق کی ناکامیاں ارے توبہ
خود اپنے دل سے مجھے مدتوں حجاب رہا

جو اٹھ گئیں وہ نگاہیں تو کیا کرو گے حفیظ
پناہِ زہد میں بیٹھے تو یہ شباب رہا

○

کب آپ کے ایسے عدوں سے تسکینِ دلِ ناکام ہوئی
اک صبح قیامت یاد آئی جب کوئی پکارا شام ہوئی

کیا جانیے دل کو توبہ کی یہ بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی
اسکے بھی کرم پر حرف آیا اپنی بھی خطا بدنام ہوئی

الفت کے تجلی پانے تک بے نور تھے حکمت کے جلوے
جب دشتِ جنوں میں صبح ہوئی زندانِ خرد میں شام ہوئی

بھڑکی ہوئی آگ دبائی بھی تو اٹھتا دھواں کب تک آہ

ہم ضبطِ فغاں کرتے ہی رہے اور دل کی حکایت عام ہوئی

اس غم میں حفیظؔ آخر کب تک چپ چاپ کھوئے کھوئے رہے

سودائے محبت چھوڑ بھی اب اٹھو دیکھو شام ہوئی

○
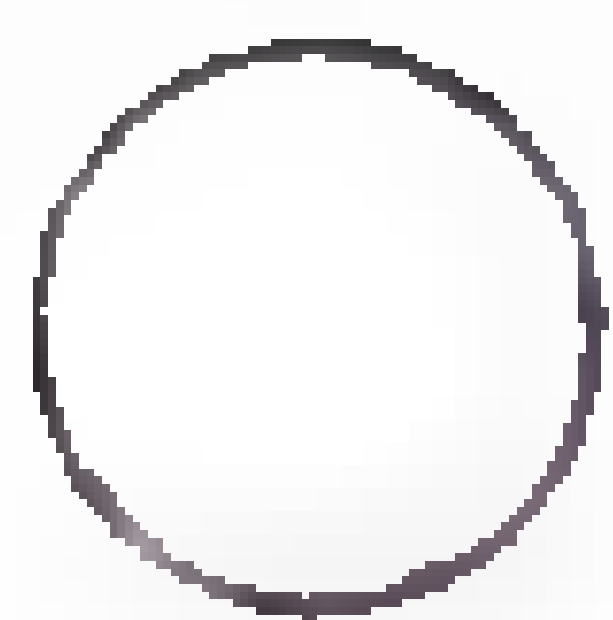
کتنے اہلِ ہوش کس کس طرح بہکانے اٹھے
آپ کے کوچہ سے اٹھنے تھے نہ دیوانے اٹھے

رنج و راحت کا وہ یوں مفہوم سمجھانے اٹھے
راہ میں کانٹے بچھا کر پھول برسانے اٹھے

وہ جو خالی کر کے میخانے کے میخانے اٹھے
آخرش ان مست نظروں کی قسم کھانے اٹھے

آتشِ نمرود [illegible] دنیا کے بھی دن پھر جاتے
لے کے تیغ ہم اگر [illegible] دیوانے اٹھے

ظرف ساقی ہی نہ جب دیکھا تو پھر کیا بیٹھتے
آنسوؤں سے بھر کے ہم آنکھوں کے پیمانے اٹھے

غمگسار آئیں نہ آئیں بزم برپا ہو نہ ہو
دل جلوں سے دل جلے کہہ سن کے افسانے اٹھے

اب خدا حافظ متاعِ دین و دانش کا حفیظؔ
واعظ کج فہم بھی تقریر فرمانے اٹھے
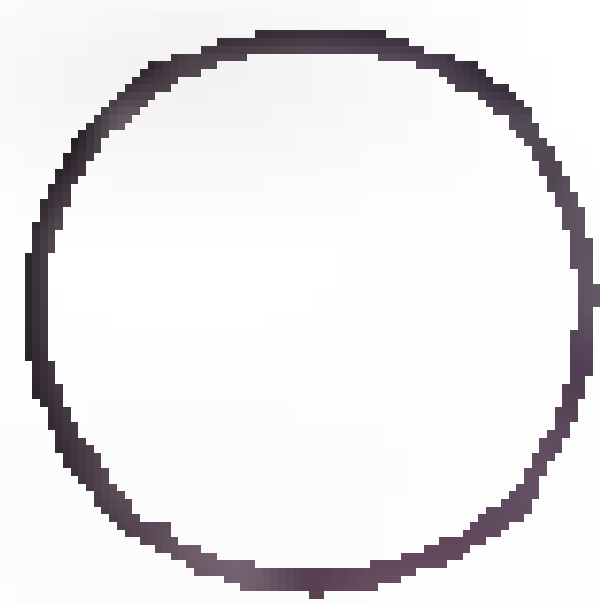
گاہ مٹتی ہے گہہ ابھرتی ہے
آرزو دل سے چھیڑ کرتی ہے

ان کی رنگینیاں سنبھل جائیں
اب مری سادگی سنورتی ہے

کہتی ہی رہتی ہے خودی جس کو
بیخودی وہ بھی کر گزرتی ہے

گر کے رہ بھی گئی حیا سے تو کیا
وہ نظر یوں بھی کام کرتی ہے

ہجر میں ہم تڑپ تو لیتے ہیں
کیا خبر ان پہ کیا گزرتی ہے
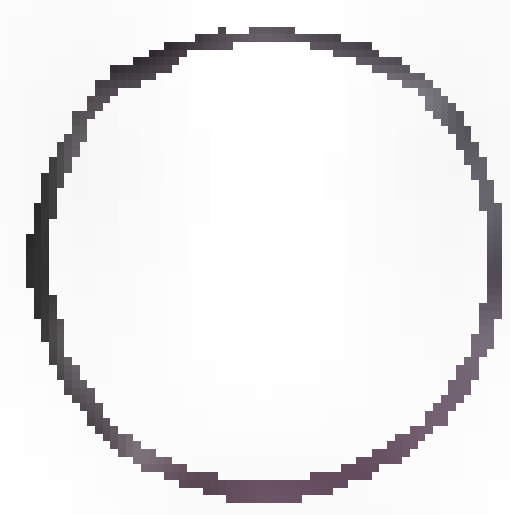
بے تابیاں ہیں اور نہ غمِ انتظار ہے
یہ اعتبار ہے کہ عدم اعتبار ہے

کیا عہد تھا کہ آپ کی نفرت بھی تھی عزیز
کیا وقت ہے کہ آپ کی الفت بھی بار ہے

سچ جان میں نے تیری تمنا کبھی نہ کی
اور یوں ترے کرم کا تجھے اختیار ہے

آپ اور دعائے مرگِ جوانی بہ چشمِ تر
کیا تلخیِ حیات بہت ناگوار ہے

کافر سرورِ عشق تو تھا ہی مگر حفیظ
اس سے بھی کچھ لذیذ یہ ظالم خمار ہے

اف رے شکایتِ جفا، واہ رے شکوۂ ستم
ہنستے رہے حضور میں، رو دیئے دور جا کے ہم

دستِ ہوس میں سیف ہے، جہل کے ہاتھ میں قلم
معرکۂ حیات میں رہ گئے خالی ہاتھ ہم

ہائے یہ کیا مقام ہے، ہائے یہ کیا نظام ہے
عشق کی آستیں بھی نم، حسن کی آستیں بھی نم

ایسا بھی انقلاب کیا، شیخ تمہیں یہ کیا ہوا
رخ تو ہے سوئے بتکدہ، پشت ہے جانب حرم

لاکھ ہم اہلِ دردِ دوست الگ تھلگ رہے
ہائے وہ زہر خند جو ہو کے رہا شریکِ غم

شاید اسی طرف سے کچھ لطف میں ہو گئی کمی
جانب کوئے دوست جو آج نہ اٹھ سکے قدم

○

اف تری بے نیازیاں پیہم
اٹھ گیا اعتبارِ دیر و حرم

ہائے وہ سادگی رنگا رنگ
ایک عالم میں سیکڑوں عالم

ان کی دزدیدہ پڑ رہی ہے نظر
اپنے لغزیدہ اٹھ رہے ہیں قدم

دیکھنا رنگِ روئے حسن حفیظؔ
عشق کی نبض ہو چلی مدہم

زہے طلب جستجو کی راہیں قدم قدم پر بدل رہے ہیں
سنبھل رہے ہیں بہک رہے ہیں، بہک رہے ہیں سنبھل رہے ہیں

کہاں وہ بزمِ ازل کے جلوے کہاں یہ دیر و حرم کے پردے
جمالِ رخ پر مچلنے والے نقابِ رخ سے بہل رہے ہیں

زہے گدازِ غمِ محبت، خوشا یہ آدابِ سوزِ الفت
نہ کچھ دھواں ہے نہ کوئی شعلہ بڑے سلیقے سے جل رہے ہیں

○
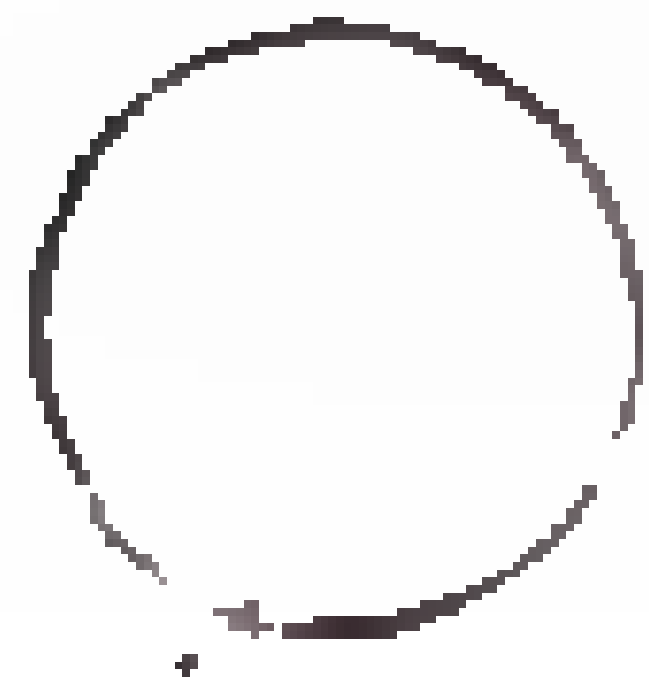
اس سے مجروح مرا ذوقِ الم ہوتا ہے

ظلم کرتا ہے جو اہلِ بہ کرم ہوتا ہے

اب قدم اہلِ جنوں ہی کو اٹھانا ہوگا

ہوش والوں میں تو یہ حوصلہ کم ہوتا ہے

ہائے اس انجمنِ ناز کے آداب جہاں

زور سے دل کا دھڑکنا بھی ستم ہوتا ہے

شکریہ آپ کے اس گوشۂ دامن کا مگر!
اشک شوئی سے کہیں درد بھی کم ہوتا ہے
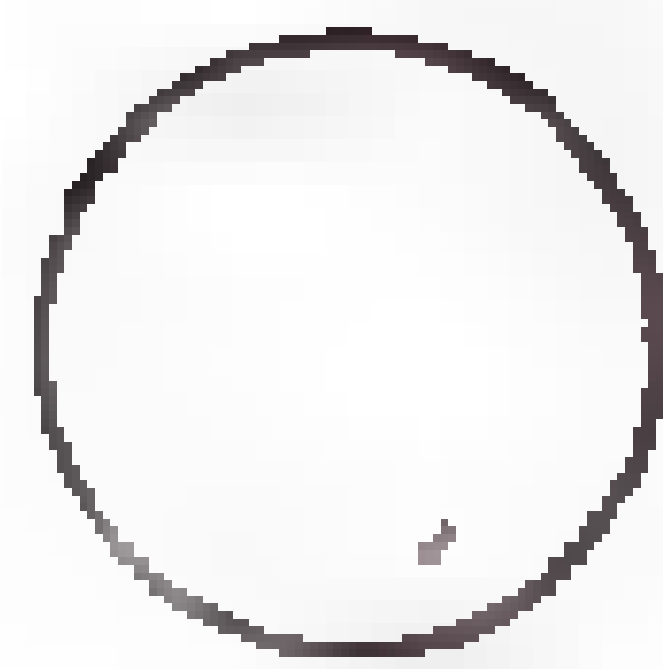
بیٹھنے بھی دے اب تو اے جنوں ٹھکانے سے
باز آئے ہم تجھ کو راہبر بنانے سے

اب بھی یاد آتے ہیں ان کے یاد آنے سے
خواب کچھ سنہرے سے وقت کچھ سہانے سے

راہ طنز کرتی ہے روٹھ جاتی ہے منزل
کارواں جھجکتا ہے جب قدم بڑھانے سے
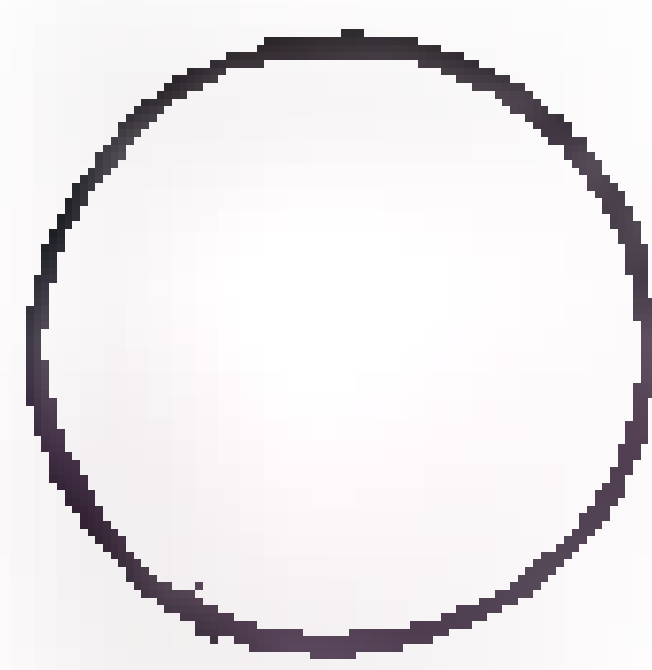
احباب سے کہدو ذرا دامن کو بچائیں
میں ڈوب رہا ہوں مرے نزدیک نہ آئیں

اس دور کے عیسیٰ تو یہی سوچ رہے ہیں
ہر زخم کو کس طرح سے ناسور بنائیں

کیا اب بھی مرے درد کا درماں نہیں ہوگا
اللہ مرے حال پہ روتی ہیں دعائیں
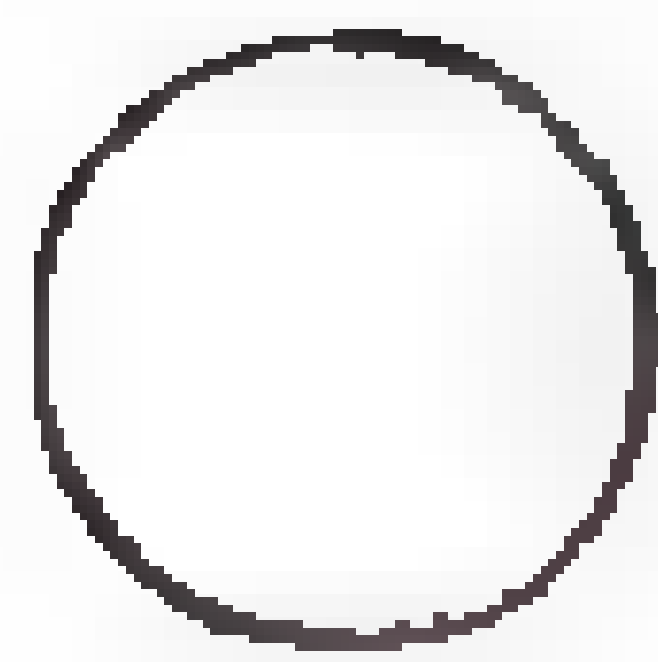
ہٹا ہٹا کے مقاماتِ این و آں سے مجھے
قریب کر دیا دل نے اس آستاں سے مجھے

حیات و موت کرشمے ہیں ان کی شوخی کے
کبھی یہاں سے پکارا کبھی وہاں سے مجھے

جو ان کے منہ سے جھڑے تھے وہ پھول زک لئے
گلہ رہے گا یہ دامانِ کہکشاں سے مجھے

کہیں نہ موجبِ الزامِ ناسپاسی ہوں
یہ خوف ہے ترے الطافِ بیکراں سے مجھے

بتوں کے بخل کی حد ہو گئی خدا کی قسم
جواب تک نہ ملا ان کے آستاں سے مجھے

فرازِ نازِ نشیبِ نیاز، سطحِ گداز
تباہیوں نے پکارا کہاں کہاں سے مجھے

یہ پرخلوص فضائیں کہاں ملیں گی حفیظؔ
اٹھا نہ اہلِ محبت کے درمیاں سے مجھے
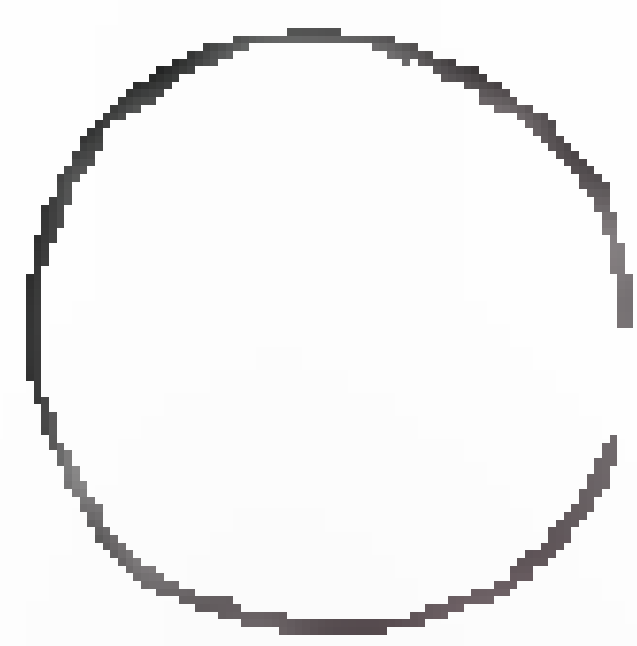
بشر سے ہو نہ سکا دردِ زیست کا درماں
بہت وسیع ہے کہنے کو عالمِ امکاں

میں سن رہا ہوں تری دھڑکنیں مگر اے دل
غمِ جہاں سے الگ تو نہیں غمِ جاناں

ربابِ عیش و طرب پہ غزل سرا شاعر
تلاشِ امن و سکوں میں حیات سرگرداں

کچھ اور ڈھونڈھ رہی ہے نگاہِ اہلِ نظر
نہ گیسوؤں کی گھٹائیں نہ عارضِ تاباں

یہ ہلتے کانپتے سُلگی سے ناتواں تنکے
ڈبو دیے انہیں تنکوں نے سینکڑوں طوفاں

دریدہ پیرہنی پر بھی لقب ہے مہ زیب
ہوس ہزار طرح کے لباس میں عریاں

شگفتگی بھی ہے تاثیر بھی لطافت بھی
پسند آئی تمہاری غزل حفیظ میاں
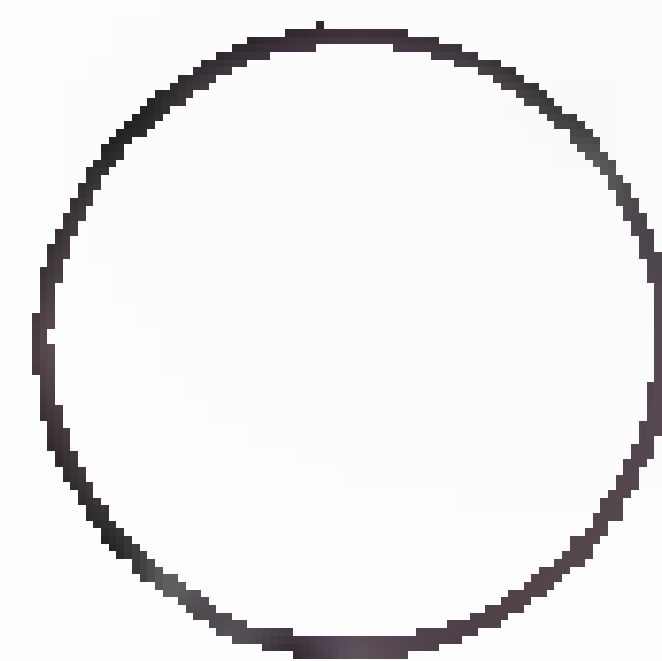
سوز نہ ہو تو سازِ حیات
صرف اک روکھی پھیکی بات

جل اٹھ جل اٹھ شمعِ یقیں۔
رات ہے اور اندھیری رات

آہ! یہ حسن کی نایابی
اُف یہ جلوؤں کی بہتات

ان کا کھیل دل آزاری
اور مرے نازک جذبات

جان ہتھیلی پر رکھ لے
کہنی ہے گر سچی بات

معصوموں پر آئے ہیں
کیسے کیسے الزامات

کوئی ہنسے کوئی روئے
یہ اپنے اپنے حالات

نا محکم بنیاد ہوس
عشق سراپا مہرِ ثبات
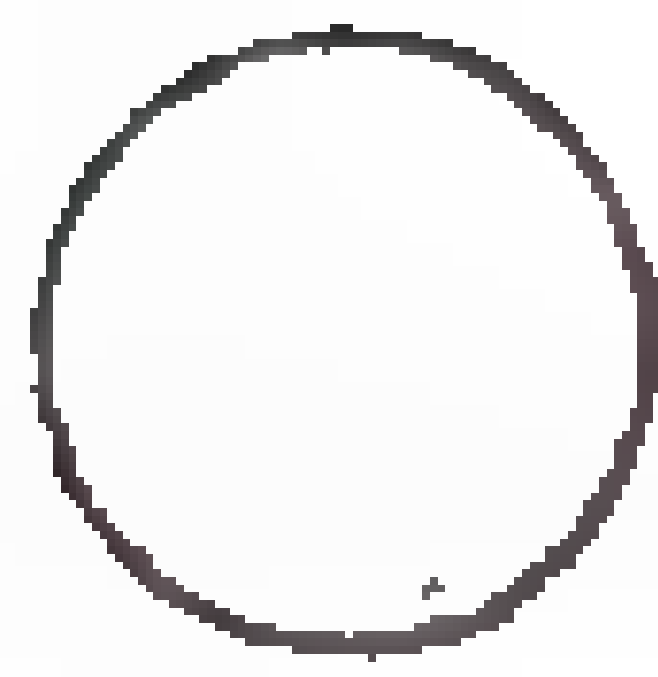
کس جگہ بیٹھیں بھلا ہم چین سے آرام سے
کوئی گوشہ بھی نہیں خالی تمہارے دام سے

سہمی سہمی دھوپ سائے لرزہ براندام سے
کون ٹکرائے اٹھا یہ گردشِ ایام سے

اے گھٹا کہیو سلام شوق خاص و عام سے
میکشوں سے ذرے ساقی سے سبوئے جام سے

جاں نثاروں کی وفا کا امتحاں لیتے ہیں آج
وہ جو واقف بھی نہ تھے کل تک وفا کے نام سے

ہل گیا مستوں کی ہا ؤ ہو سے میخانہ مگر
ایک قطرہ بھی نہیں چھلکا کسی کے جام سے

کون کہتا ہے ہمارے دوستوں میں تھا حفیظؔ
کیا تعلق ہمکو اس برباد سے بدنام سے
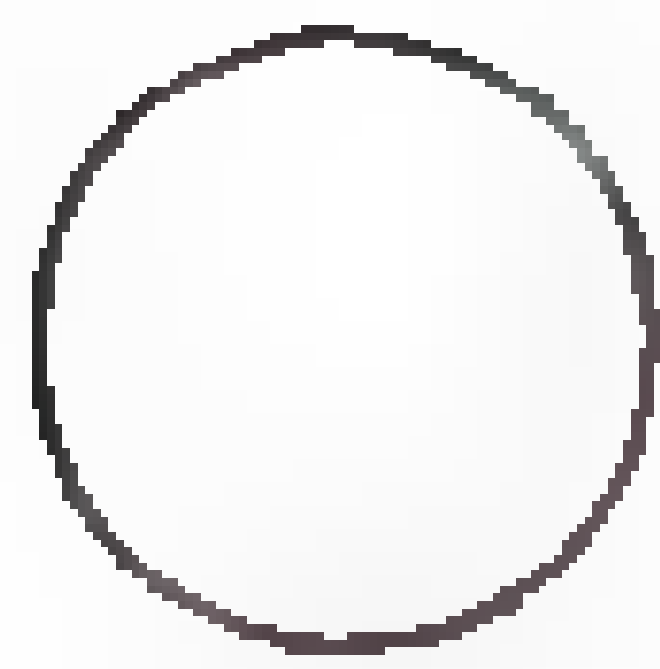
بے قرینہ ہو کے پھیکا پڑ گیا پھولوں کا رنگ
خار و خس ترتیب پا کر خوشنما سے ہو گئے

جانے کیا آیا حریم نازو نعمت سے جواب
جو سراپا شوق تھے بے مدعا سے ہو گئے

اٹھ گیا بالکل ہی جب عشق و ہوس کا امتیاز
ہم تری محفل سے دل برداشتہ سے ہو گئے

دورِ غم میں کون انجامِ تعلق دیکھتا
آپ ہی اپنوں سے ہم نا آشنا سے ہو گئے

خدمتِ شعر و سخن بھی کیجئے کچھ تو حفیظ
آپ تو رنج و محن میں مبتلا سے ہو گئے
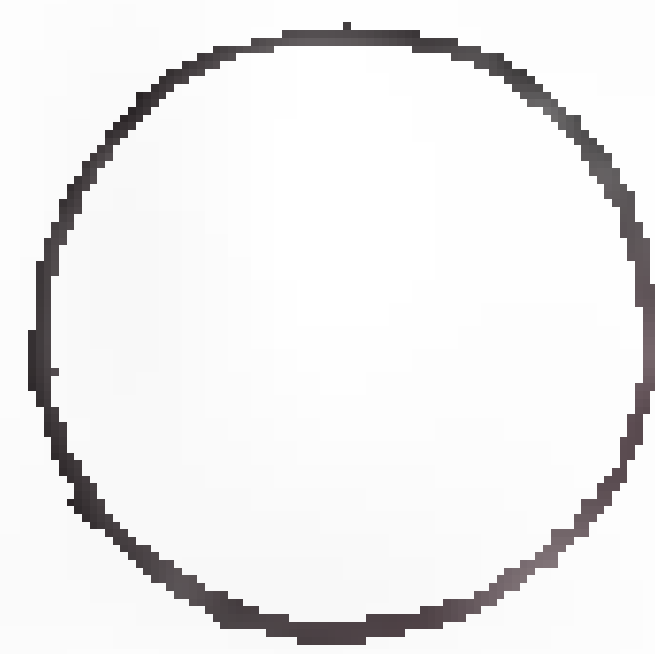
تواضع کر رہا تھا جب چمن خارِ مغیلاں سے
جنوں کا دستِ شفقت دور کیوں رہتا گریباں سے

گئے وہ دن رہا کرتے تھے ساحل پر بھی لرزاں سے
سفینے خود الجھنا چاہتے ہیں آج طوفاں سے

مری غمخوار دنیا کو بہت تکلیف ہوتی ہے
مرے غمگین چہرے سے مرے حالِ پریشاں سے

مری راہوں میں کانٹے ہیں مری منزل ہی شعلوں میں
کوئی کیوں باندھتا ہے اپنا دامن میرے دامن سے

○
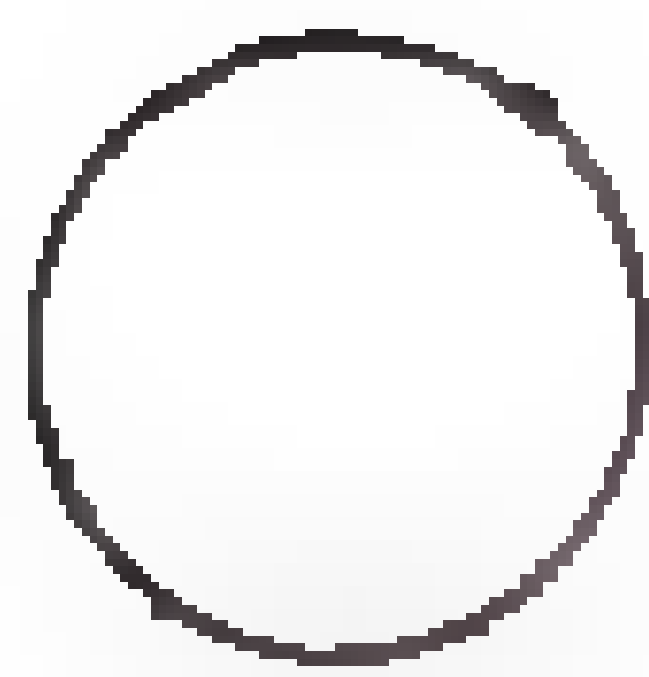
جائیے ہو کے بے قرار کہاں
سب ہیں غمگیں، غمگسار کہاں

اب کے پھولوں میں وہ مہک ہی نہیں
لٹ گئی عصمتِ بہار کہاں

دیر کے پاس یا حرم کے قریب
ہم کریں تیرا انتظار کہاں

ہر گھڑی لب پہ ذکرِ یار تو ہے
دل میں ہر دم خیالِ یار کہاں

اوپری مسکراہٹوں کی قسم
اٹھ سکا تیرے غم کا بار کہاں

ایک انداز پر رہے نہ قائم
زندگی اتنی وضعدار کہاں

ہائے اس دورِ خود نمائی میں
پردہ داری بھی پردہ دار کہاں

درد نے چین سے نہیں رہنے دیتا
دل میں گنجائشِ قرار کہاں

سہہ سکے بار آشیانے کو
شاخِ گل اتنی پائیدار کہاں
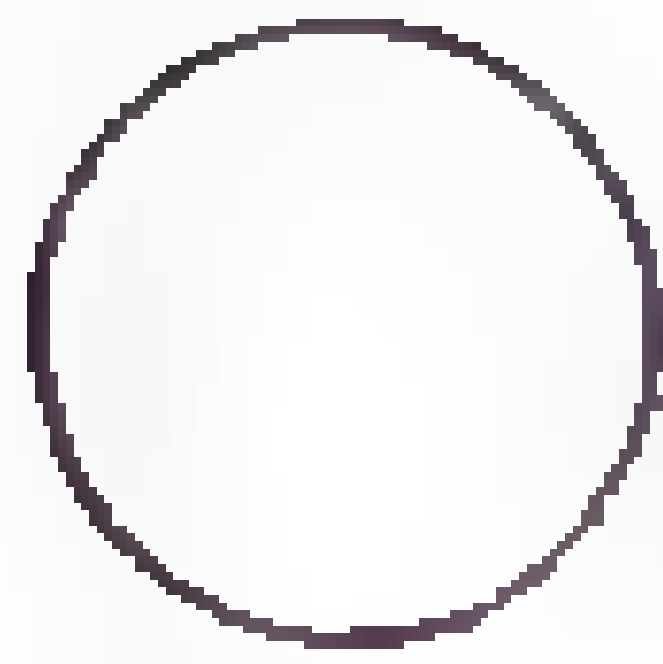
کہاں یہ سطح پسندی ادب کو لے آئی
جہاں نظر کی بلندی نہ دل کی گہرائی

اب آدمی کا ٹھکانہ، نہ کائنات کی خیر
سنا ہے اہلِ خرد ہو گئے ہیں سودائی

ہزار حیف کہ تم بھی بے وفا ٹھہرے
ہزار شکر کہ ہم کو ہوس نہ راس آئی

اب اپنے جیب و گریباں کا کیا سوال رہا
جنوں کا ہاتھ بٹانے کو خود بہار آئی

حیات پوچھ رہی تھی سکون کا مفہوم
تڑپ کے دل نے ترے درد کی قسم کھائی

اسی کی راہ میں آنکھیں بچھائیگی منزل
وہ عزم جو نہیں محتاجِ ہمت افزائی

مشاعروں میں حفیظؔ آج کل وہی جائے
کہ جس کو خدے زیادہ ہو ذوقِ رسوائی
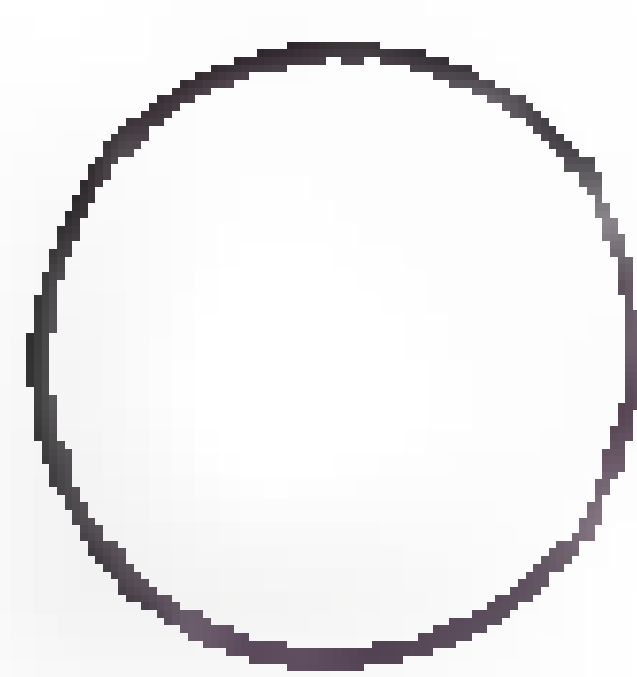
چھا جائے گی ماحول پہ کچھ اور اداسی
بجھتی ہوئی شمعوں سے چراغاں تو نہ ہوگا

انسان کو انسان کا غمخوار بنا دے
اس دور سے یہ کار نمایاں تو نہ ہوگا

خود اس نے کہا ہی تو اسے کیوں نہ بھلاؤں
جاناں سے زیادہ غم جاناں تو نہ ہوگا
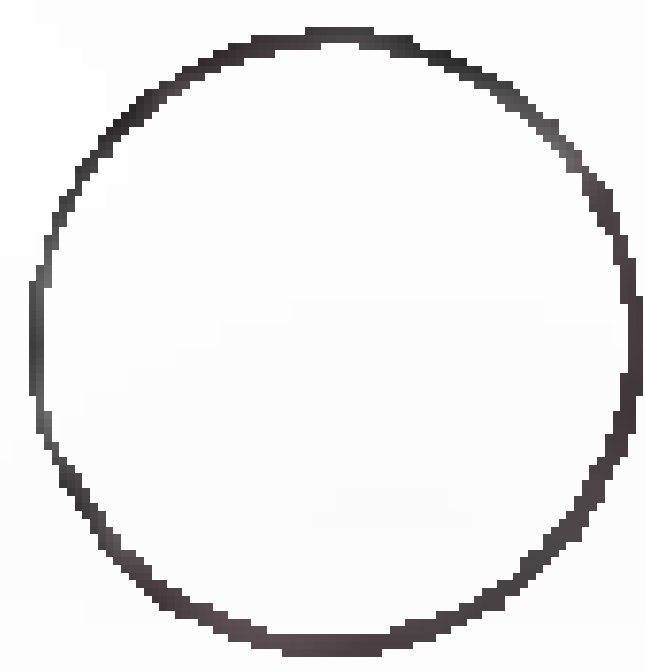
توجہ ہی انھیں جب دل پہ فرمائی نہیں ہوتی
کوئی شے بھی دوائے دردِ پنہانی نہیں ہوتی

نہ جانے اس زمین و آسماں کا حشر کیا ہوگا
جہانگیروں سے بھی بارِ جہاں بانی نہیں ہوتی

زباں بندی سے کب جذبات کا سیلاب رکتا ہے
حدودِ جبر کی پابند طغیانی نہیں ہوتی

ادائے فرضِ پرا ہلِ وفا کا شکریہ کیا
محبت میں تو قربانی بھی قربانی نہیں ہوتی

نہیں ہٹتا دھندلکا بدگمانی کا نہیں ہٹتا
نہیں ہوتی فضائے بزم نورانی نہیں ہوتی

کھلی آنکھوں سے میں نے معجزاتِ عشق دیکھے ہیں
خرد کے شعبدوں پر مجھکو حیرانی نہیں ہوتی

ترے ماتھے کی شکنیں سرکشی کی داستانیں ہیں
دلیلِ عجز سجدوں کی فراوانی نہیں ہوتی

حفیظ اپنی زباں تو وقفِ اظہارِ حقیقت ہے
برائے غیرِ حق مجھ سے غزل خوانی نہیں ہوتی

عقل آوارہ کہیں جہل بداماں تو نہیں
ہم نے نظم سے بزم اور پریشاں تو نہیں

موجیں سمٹی ہوئی، سہمی ہوئی سطحِ دریا
آج کشتی کوئی آمادۂ طوفاں تو نہیں

ابھی دیوانہ بنوں گا ابھی آئے گی بہار
ان کے دامن سے عزیز اپنا گریباں تو نہیں

دہر میں اور بھی سامانِ سکوں ہیں لیکن
یہ گھنی چھاؤں ترا سایۂ مژگاں تو نہیں
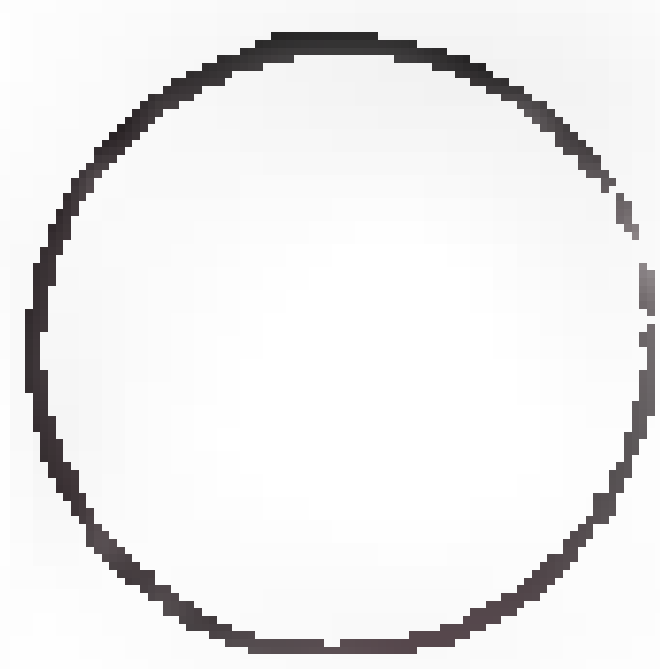
خرد کر لی حقیقت آشنا کیا
سوائے وہم اسکے پاس تھا کیا

محبت کچھ تجارت تو نہیں ہے
دلِ ناداں وفاؤں کا صلہ کیا

کبھی تنہائی میں سن دل کی آواز
بس بیگانگی رابطہ کی صدا کیا

مجھے خود سے بھی دلچسپی نہیں اب
کسی کی بے نیازی کا گلہ کیا

حسیں خوابوں کی تعبیریں کہاں ہیں
محبت نے مجھے [illegible]

قدم جب رکھ دیا راہِ طلب میں
تو پھر کیفیتِ بیم و [illegible] کیا

چھپا جاتا ہے منہ ہاتھوں کے پیچھے
پشیمانی بھی ہے شرطِ دعا کیا

حسن جنوں نواز کا دیکھا جو التفات
مستی میں آکے موت سے ٹکرا گئی حیات

اب وہ ترا خیال نہ بیزاری حیات
نفرت بھی بے ثبات محبت بھی بے ثبات

اے محو انتظار ستارے نہیں ہیں یہ
ہنستی ہے تیری سادہ دلی پر اندھیری رات

بے تابیاں بڑھی ہیں زمانہ کی جس قدر
اتنی ہی یاد آئی ہیں ان کی نوازشات

جس سمت دیکھئے وہیں رستے ہوئے زخم
ویسے بڑا حسین ہے دورِ ترقیات

طے کیجئے گا دار پہ کہنا ہے کیا حفیظ
اک بزدلی کی بات ہے اک مردمی کی بات
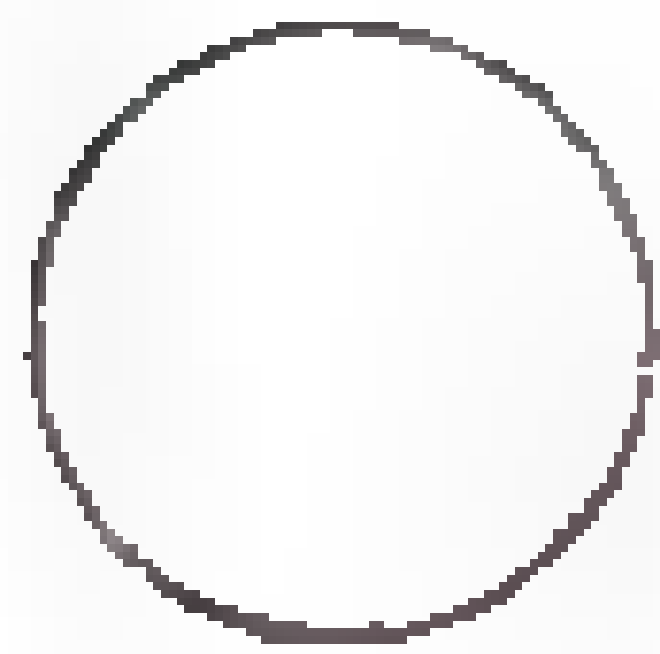
اپنی آنکھوں سے لہو اپنا جگر دیکھ لیا
جو کچھ آیا تری محفل میں نظر دیکھ لیا

ایک بار آیا تھا تعمیر نشیمن کا خیال
ہر طرف سلسلۂ برق و شرر دیکھ لیا

تنا ہی جانے اس دور میں مفہوم سکوں
جان سی آگئی جب دوش پہ سر دیکھ لیا

جگمگانے لگے ذرے تو ستارے نہ رہے

تیرے اندھیر بھی اے نورِ سحر دیکھ لیا

یہ دل و جان تو اک جام کی قیمت بھی نہیں

ہائے کیا ہوگا جو ساقی نے ادھر دیکھ لیا
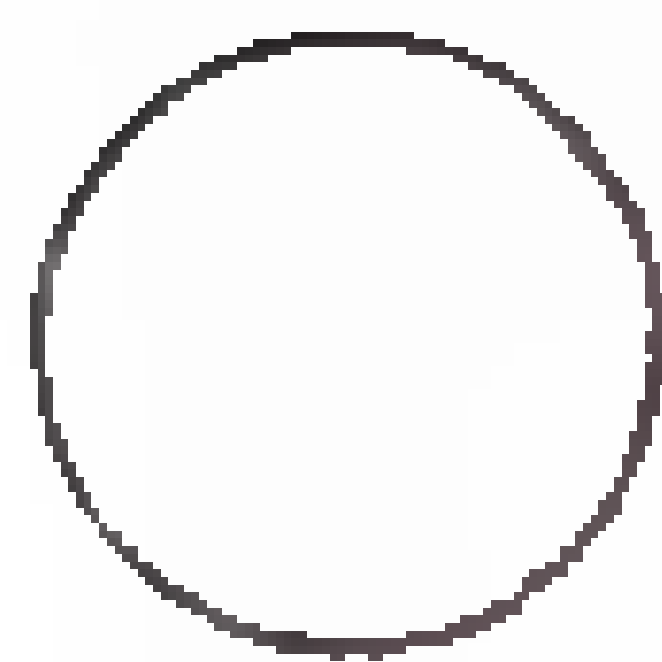
ک اشک مظہرِ صد اضطراب ہو بھی چکا
ستارہ رشکِ مہ و آفتاب ہو بھی چکا

دماغِ اہلِ سیاست پہ اعتبار نہ کر
دماغِ اہلِ سیاست خراب ہو بھی چکا

کھلیں کہ بند رہیں راحتوں کے دروازے
حریمِ صبر میں دل باریاب ہو بھی چکا

قصور وار سزاؤں سے جب رہے محروم
شکستِ دل نے خبر دی عتاب ہو بھی چکا

اسی لئے تو یہ مضراب و تار روتے ہیں
حفیظؔ تارکِ چنگ و رباب ہو بھی چکا

○

اس خلش کا کم سے کم اتنا تو درماں چاہیئے
ایک نشتر ہر نفس جزوِ رگِ جاں چاہیئے

ڈوب جائے گی یہ کشتی گر اسے ساحل ملا
زندگی کو ہر قدم پر ایک طوفاں چاہیئے

پُرفریبِ آب و گل ہے اس پہ کیا ڈالے گی آنکھ
روحِ گلشن چاہیئے، جانِ گلستاں چاہیئے

اور ہمت ہو تو یہ پردہ بھی کر دے چاک چاک

سائنس بھی کیوں درمیانِ جان و جاناں چاہیئے

وجد سا آنے لگا ہے اہلِ محفل کو حفیظ

تیرے بعد ایک اور تجھ سا ہی غزل خواں چاہیئے
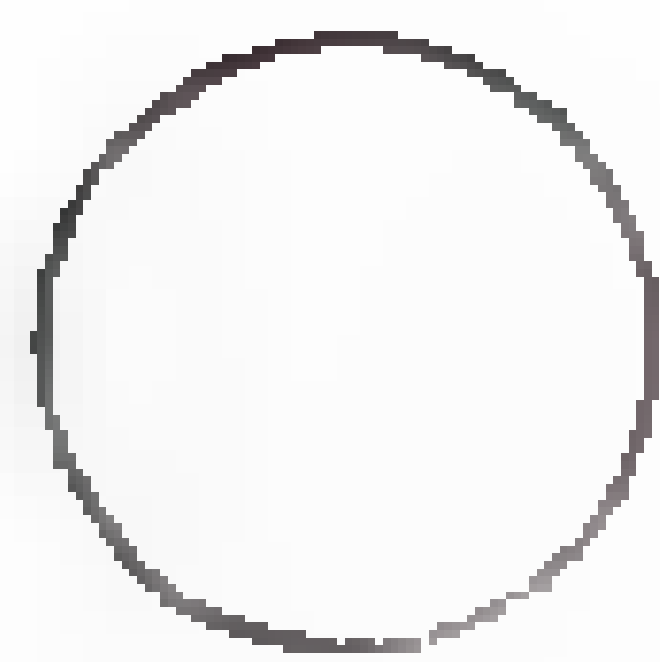
نظر یہ کیوں ہیں مناظر گراں نہیں معلوم
یہ رونقیں ہیں کہ ویرانیاں نہیں معلوم

خرد کی بات پہ ہنس کر گذر بھی جائے دل
خرد کو فرقِ یقین و گماں نہیں معلوم

خبر نہیں کہ گرے ہیں کہاں کہاں آنسو
کدھر کدھر سے اٹھے گا دھواں نہیں معلوم

تمام راہ لہو میں ہے غرق لے منزل
کہاں تک آئے تھے سود و زیاں نہیں معلوم

خلوصِ عشق ذرا تو ہی دیکھنا بڑھ کر
حجاب ہے کہ نظر درمیاں نہیں معلوم

حفیظؔ ہم تو روانہ ہوئے، خدا حافظ!
قدم اٹھائے گا کب کارواں نہیں معلوم
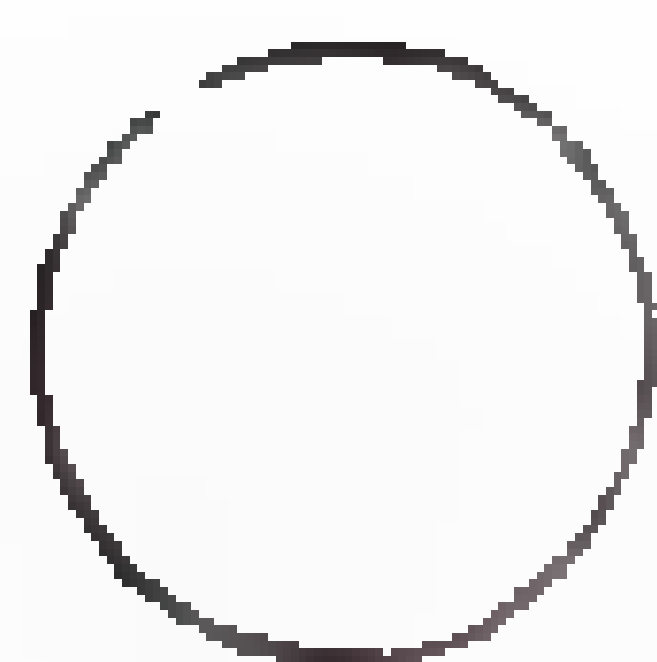
بلبل کے نغموں پہ نہ جا گل کی رنگینی مت دیکھ
میرا افسانہ مجھ سے سن میں خود ہوں اپنی آواز

بزم طرب میں آج ذرا ہم بھی ہوئے تھے نغمہ سرا
ہم کو [illegible] چیخوں کی ساز سے کیا ملتی آواز!

بربادیاں بھی عشق میں بے فائدہ نہیں
اب آس پاس اہلِ ہوس کا پتا نہیں

معذور اگر دوا کا نہیں ہے دعا تو کر
قسمت کا آسرا تو کوئی آسرا نہیں

کافی ہے صرف اپنے پرائے کا امتیاز
اس دورِ بے بصر میں کچھ اچھا برا نہیں

امیدوار اس نظرِ بے نیاز کی بھی
دل بھی کبھی کبھی جسے پہچانتا نہیں

[illegible]
[illegible]

تو اس سے بدگمان نہ ہو یہ ترا حفیظ
کتنا ہی بے نیاز سہی بے وفا نہیں

اگر دل سوزِ الفت کی تپش سے داغدار ہو جائے
تو ہر آتش کدہ گلزار ہی گلزار ہو جائے

تجھے کیا ہے اسی ہمت شکن طوفاں کے پہلو سے
کوئی ایسی بھی موج اٹھے کہ بیڑا پار ہو جائے

جفا کار دل سے اس طرزِ جفا کی داد دیتا ہوں
ستم ڈھانے لگے کوئی تو وہ غمخوار ہو جائے

مغنّی تیرے نغموں نے تو انسان کو سلایا ہے
مری جھنجھوڑ سے شاید آدمی بیدار ہو جائے

نہ ہو جو معترض باطل خداؤں کی خدائی پر
یہ مشکل ہے حقیقتاً اس قسم کا دیندار ہو جائے
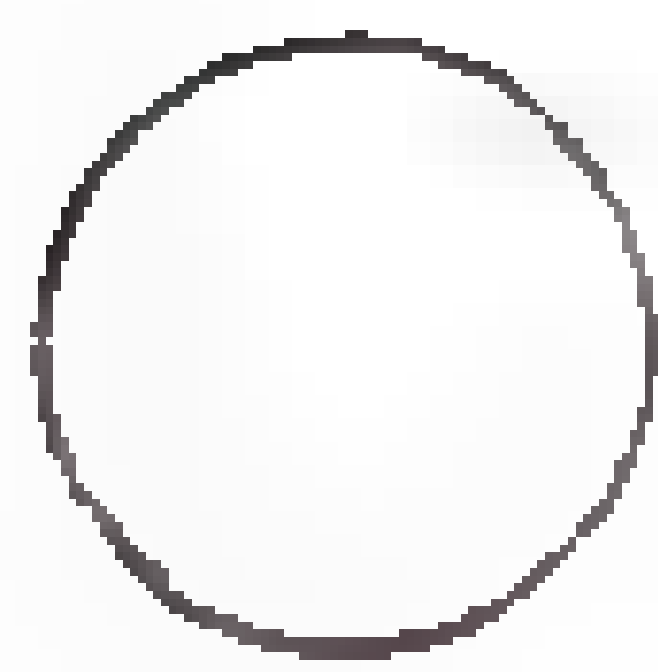
رشکِ فردوس. ہم اس سیر و سفر سے گذرے
دل لرز اٹھا وہ نظارے نظر سے گذرے

راہ روکے ہوئے خود راہنما بیٹھے ہیں
اب کوئی قافلہ گذرے تو کدھر سے گذرے

ف یہ جادہ کہ جسے دیکھ کے جی ڈرتا ہے
کیا مسافر تھے جو اس راہ گذر سے گذرے

حسنِ منزل کی قسم، زندگیِ دل کی قسم
رقص کرتے ہوئے ہم برق و شرر سے گذرے

جانے کیا کہہ گئے ماحول سے جاتے جاتے
وہ اندھیرے جو ابھی چاکِ سحر سے گذرے

کوئی چپکے سے دیدۂ دل کو سجا کر جو ہنسے
بارہا ان سے وہ غنچے جو صبا سے گذرے
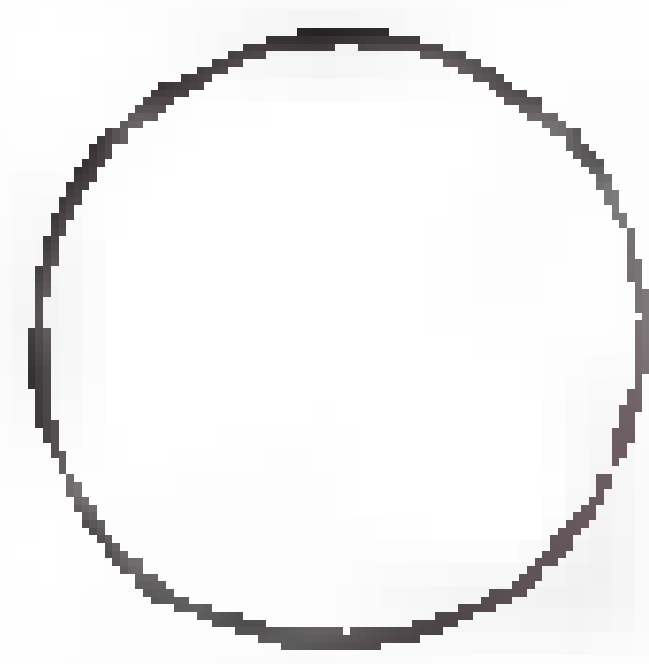
جب بھی کسی جانب سے ہوا ان پہ کوئی وار
ہو ہو کے شہیدانِ وفا سینہ سپر آئے

ہستی ہی نہیں سب تری جلووں سے نگاہیں
آنکھوں کو جِدھر دیکھتے ہیں تو ہی نظر آئے

یہ وقتِ عمل اور یہ حفیظؔ آپ کی سستی
اچھی نہیں وہ نیند جو ہنگامِ سحر آئے

ہوا قدر داں اس قدر تو زمانہ
کہ جس کی سپر ہوں اسی کا نشانہ

بہت اس سے اونچی ہے پرواز میری
میں ہرگز نہیں بندۂ آب و دانہ

اس اک مرکزِ دین و دنیا سے ہٹ کر
نہ تیرا ٹھکانہ، نہ میرا ٹھکانہ

نہ پڑ ماضی و حال کی الجھنوں میں
صداقت نہیں ہے اسیرِ زمانہ

مجھے دوستی کی قسم دینے والے
مری دشمنی بھی نہیں دشمنانہ

[illegible]
ظفر عارف [illegible]
[illegible]
نہیں شاعری یہ فقط شاعرانہ

مٹ گیا باغ سے ناموس خودی کی خاطر

گل کہاں رہتا جو ہم رنگ خزاں ہو جاتا

یہ ہنر بھی کوئی شے تھی تماشے کی حفیظ

تو عیاں ہوتے نہ تو تم بھی نہاں ہو جاتا

کہاں کے مالک و مختار ہم تو کچھ بھی نہیں
فریب دے نہ دربار ہم تو کچھ بھی نہیں

مری جھجک پہ وہ ساقی سے شیخ کا ارشاد
یہ اک یہی تو ہیں بدمست ہم تو کچھ بھی نہیں

جب ان کے پاس گئے تھے بدرد دل تو کہا
ہمیں نہ چھیڑیے بیکار ہم تو کچھ بھی نہیں

آخرش چوٹ کھا گئی دنیا
بچا بھی زد میں آ گئی دنیا

آدمی نے جب [illegible]
آہ جب مٹ مٹا گئی دنیا

بات کو بات کہہ دیا میں نے
سنتے ہی بوکھلا گئی دنیا

ساتھ چلنا تو خیر مشکل تھا
روکنے سے بھی کیا گئی دنیا

ٹھوکریں در بدر کی کھا کھا کر
ان کے قدموں میں آ گئی دنیا

تجھ سے چھپا تری قسم دے کر
کیا کروں بھید پا گئی دنیا

کس نے سمجھا ترے غم کو حفیظؔ
گدگدا کر رلا گئی دنیا
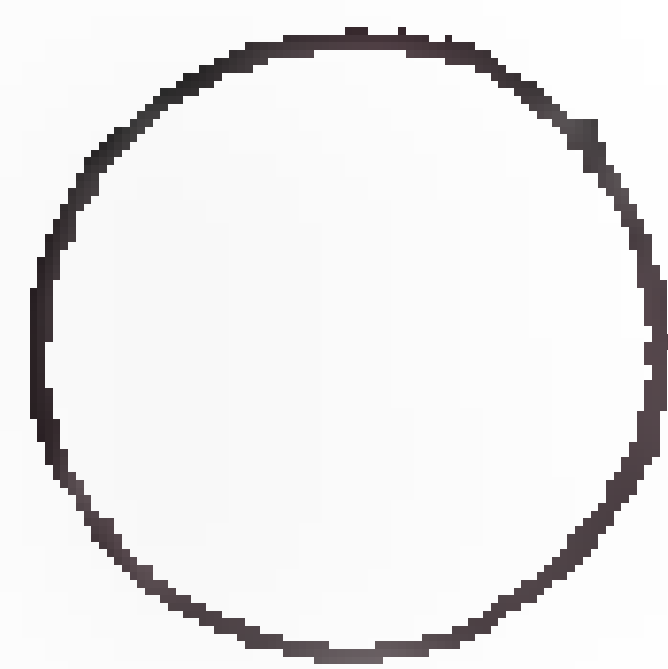
کیسی ہی مصیبت ہو بڑے شوق سے آئے
کم ظرف کے احسان سے اللہ بچائے

اب تک دیئے جاتے ہیں دلاسوں پہ دلاسے
وہ جھوٹے سہارے جو کبھی کام نہ آئے

میں آج نئے عزم سے پر تول رہا ہوں
کوئی مری پرواز کی راہوں میں نہ آئے

پھولوں کو تو سر خوب چڑھاتا ہے زمانہ
ہے کوئی جو کانٹوں کو بھی سینہ سے لگائے

دامن کا کبھی غم ہے، کبھی فکر گریباں
ہم ہوش میں آئے بھی تو کیا ہوش میں آئے

جس شاخ نے آغوش میں کلیوں کو کھلایا
اس شاخ نے پھولوں کے جنازے بھی اٹھائے

رہتا ہے حفیظؔ اہلِ تکبر سے گریزاں
اس شاعرِ مغرور کو منہ کون لگائے

○
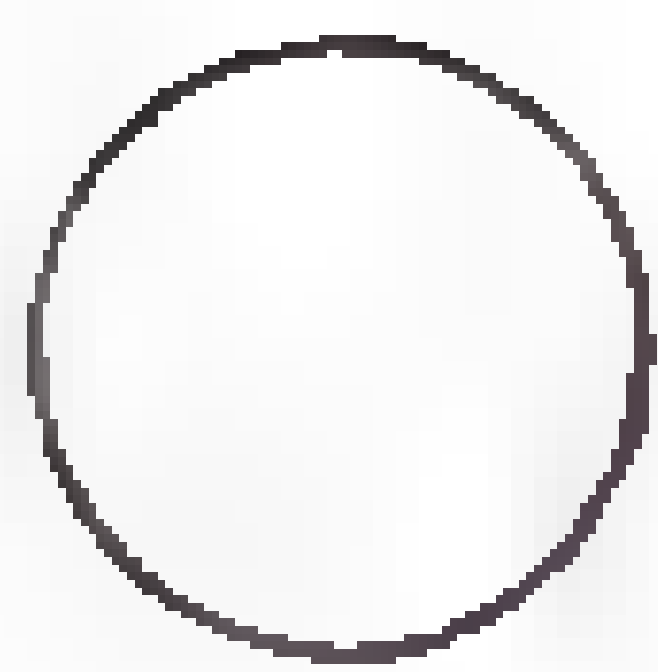
بلبل ہی کوئی مائلِ آہ و فغاں ملے
گلشن میں زندگی کا کہیں تو نشاں ملے

ہاتھ آ گئے جو چاند ستارے تو کیا ہوا
اس آستاں کی خاک کے ذرّے کہاں ملے

اے کاش میرے اجڑے نشیمن کے سامنے
خاموش سر جھکائے ہوئے باغباں ملے

اللہ رے بہار کی یہ جیسرہ دستیاں
دامن یہاں ملے تو گریباں وہاں سے ملے

چھوٹوں سے یوں بڑوں کو تکبر نہ چاہیئے
جھک کر ملے زمیں سے اگر آسماں سے ملے

اے دل ہجوم غم میں غنیمت ہے بے کسی
چیخیں نکل پڑیں جو کوئی مہرباں سے ملے

آتی تھی قہقہوں کی صدا دور سے حفیظؔ
دیکھا قریب جا کے تو آنسو رواں سے ملے

جنونِ شوق سے جب کام جھنجھلا کر لیا میں نے
حوادث کو ہم آہنگِ تمنّا کر لیا میں نے

الٰہی کون سی منزل ہے یہ دنیا پرستی کی!
کسی نے نام پوچھا اور سجدہ کر لیا میں نے

نہ ہوں حیران میرے قہقہوں پر مہرباں میرے
فقط فریاد کا معیار اونچا کر لیا میں نے

خزاں کے خوف سے پھولوں نے شکلیں تک بدل لیں
ادھر رنگِ قبا کچھ اور گہرا کر لیا میں نے

کبھی ایسی بھی رت لائے گی فطرت باغِ عالم میں
کہ جب جس شاخ پر چاہا بسیرا کر لیا میں نے

ادھر آ تجھ سے رازِ سوز و سازِ زندگی کہہ دوں
رگوں میں خون، دل میں درد پیدا کر لیا میں نے

رسا ہوں یا نہ ہوں نالے یہ نالوں کا مقدر ہے
حفیظؔ آنسو بہا کر جی تو ہلکا کر لیا میں نے
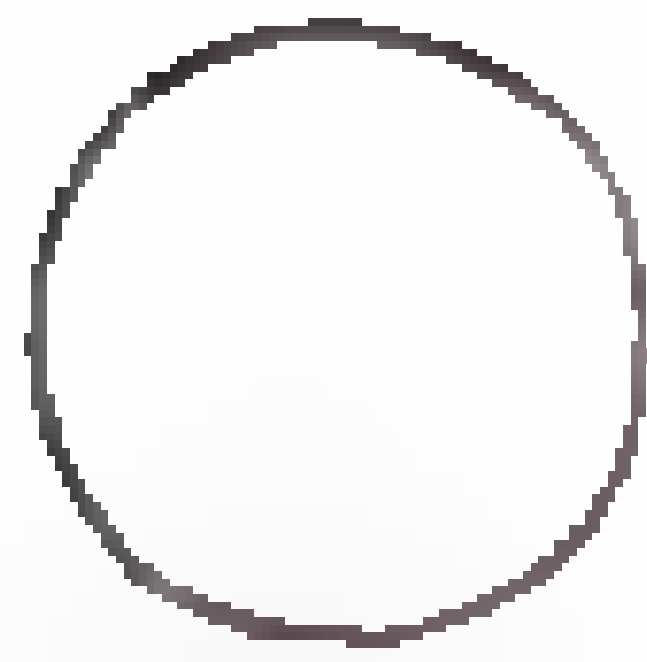
یہ کمال سادگی ہے کہ مقام بے نیازی
مرا کھیل سنگ باری، میرا کام شیشہ سازی

کوئی ہوش سے گریزاں، کوئی جوش سے گریزاں
وہ جنوں کی حیلہ سازی، یہ خرد کی حیلہ سازی

تری تیغ خوں سے رنگیں، تری لاش خوں سے رنگیں
بایں واقعات خونیں نہ شہید تو نہ غازی

وہ تبارزہ زورِ بازو، یہ خرابِ رسمِ تقویٰ
کہ عجم نزا بیاہی، تو عرب نزا نمازی

یہ خلوص ہی کی نعمت ہے شریعتوں کی عصمت
جو یہ ہو تو دین داری، یہ نہ ہو تو دین بازی

میں ندامتوں سے توبہ تو ہزار بار کرلوں
مگر اس جدیدیت کا کوئی وصف امتیازی

کبھی فخرِ میکدہ تھے جو وہی حفیظ صاحب
سرِ بزم دینے آئے ہمیں درسِ پاکبازی

دور ہوتی جا رہی ہے منزلِ انسانیت
جانے یہ دنیا ہے کس کافر کی بھٹکائی ہوئی

ہر گھڑی عہدِ محبت، ہر نفس پاسِ وفا
بیڑیاں یہ بھی ہیں لیکن انکی پہنائی ہوئی

ہو گئی شاید مسرت کی حقیقت بے نقاب
ہر مغنی کی صدا ہے آج بھرّائی ہوئی

کتنا اونچا ہے زمانہ کا یہ معیارِ خلوص
قعرِ گمنامی سے ہم نکلے تو رسوائی ہوئی

میری جانب سوچ کر بڑھنا ذرا اہلِ کرم
ہاں یہ دنیا ہے اسی سائل کی ٹھکرائی ہوئی
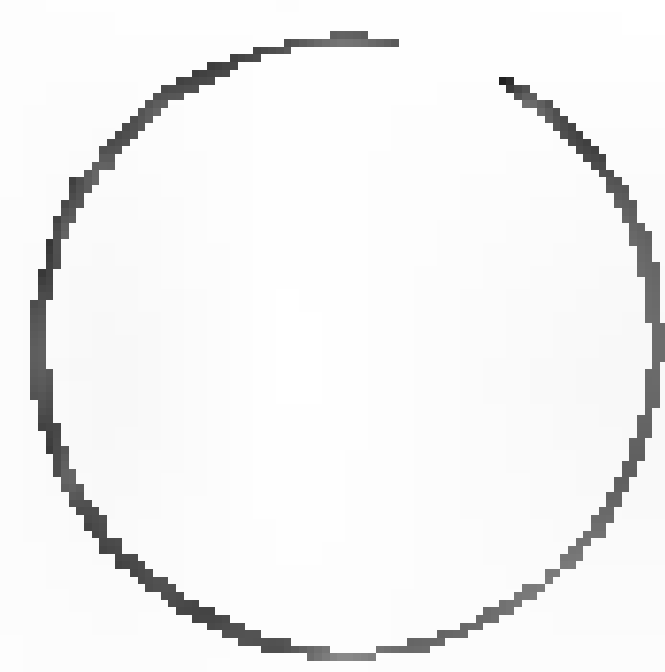
کسی جبیں پہ شکن نہیں ہے کوئی بھی مجھ سے خفا نہیں ہے
بہ غور میرا پیام سن شاید ابھی جہاں نے سنا نہیں ہے

سلام کی جرأتیں نہیں ہیں نگاہ کا حوصلہ نہیں ہے
اگر وہ قسمت سے مل گئے ہیں تو اب ہمارا پتا نہیں ہے

غلط ہے تیرا خیال اے دل سمجھ نہ آتا کبھی اسکو غافل
یہ درد میں دلکشی سی کیوں ہے اگر وہ درد آشنا نہیں ہے

سفینۂ عہد نو پہ چھایا ہوا ہے بہروپیوں کا لشکر
یہاں ہر اک ناخدا نما ہے مگر کوئی ناخدا نہیں ہے

خیال کے دیوتا بھی جھوٹے عمل کے اندھے خدا بھی جھوٹے
خرد بھی فریاد رس نہیں ہے جنوں بھی مشکل کشا نہیں ہے

ہر ایک مےکش کے ظرف سے باخبر ہے کتنی نگاہ ساقی
کسی کو ہے حکم جاں نثاری، کسی کو اذن وفا نہیں ہے

کہاں کا شاعر خدائے شعر و سخن بھی ہم اس کو مان لیتے
حفیظؔ میں یہ بڑی کمی ہے کہ بندۂ خود نما نہیں ہے

○
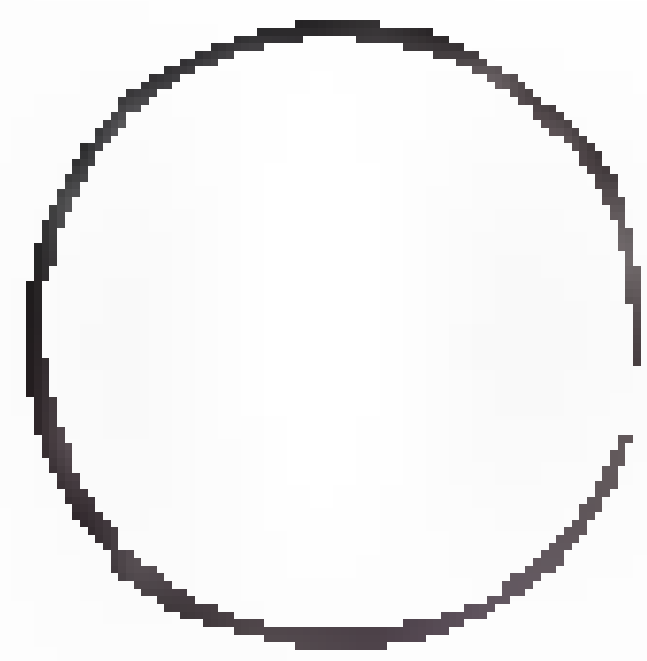
کارواں چاہے مختصر ہو جائے
کوئی رہزن نہ ہمسفر ہو جائے

خام اب بھی نہیں ہے عشق مگر
چوٹ کھائے تو پختہ تر ہو جائے

بارِ مرہم بھی زخم پر منظور
تاکہ تسکین چارہ گر ہو جائے

اس فریبِ سکون و راحت پہ
اتنا ہنسئے کہ آنکھ تر ہو جائے

ہو نہ تقدیر کا اگر قائل
آدمی آدمی کے سر ہو جائے

دھڑکنیں بن کے اہل دل کا پیام
سننے والا قریب تر ہو جائے

یہ ذرا اچھا نہیں کلام حفیظ
کاش تو صاحب نظر ہو جائے

بالآخر جان دے کر جستجو کا حق ادا کرتے
بہت نزدیک تھی منزل اگر کچھ حوصلہ کرتے

یہ اپنی تنگ ظرفی ہے کہ ہم خود بھی نہیں لیتے
زمانہ اپنا ہو جاتا اگر آغوش وا کرتے

سکوں اب خود فریبی میں نہ کچھ عالم فریبی میں
حقیقت آشنا ہوتے حقیقت آشنا کرتے

عجب کیا تھا اسی میں سے دوا بھی کوئی مل جاتی
ابھی کچھ اور دردِ زندگی کا تجزیہ کرتے

حفیظ اب مرحبا کے شور سے تسکیں نہیں ہوتی
کبھی نقد و نظر سے بھی غزل کو آشنا کرتے

———— ————
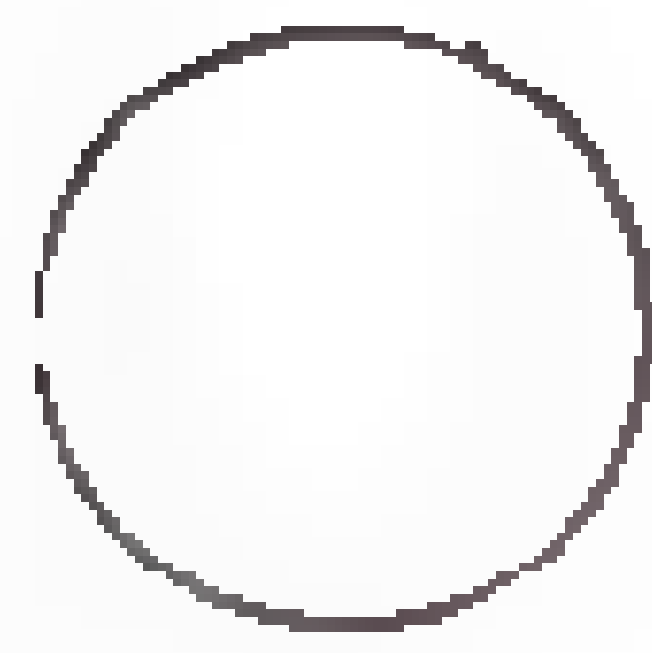
دلائل کی ترازو میں خدا کو تولنے والے
تجھے اتنا نہ سمجھا دے بشر کیوں ہی بشر کیا ہے

سفر ہی ابتدا میری، سفر ہی انتہا میری
مسافر ہوں مجھے اندیشۂ شام و سحر کیا ہے

دھندلکوں سے بھی گذرا ہوں اندھیروں سے بھی گذرا ہوں
مرے اندر یہ تاریکیٔ قلب و نظر کیا ہے

یہ محفل ہے یہاں شمعیں تو گل ہوتی ہی رہتی ہیں
مگر اے ہم نفس یہ رخصت سوز جگر کیا ہے

○
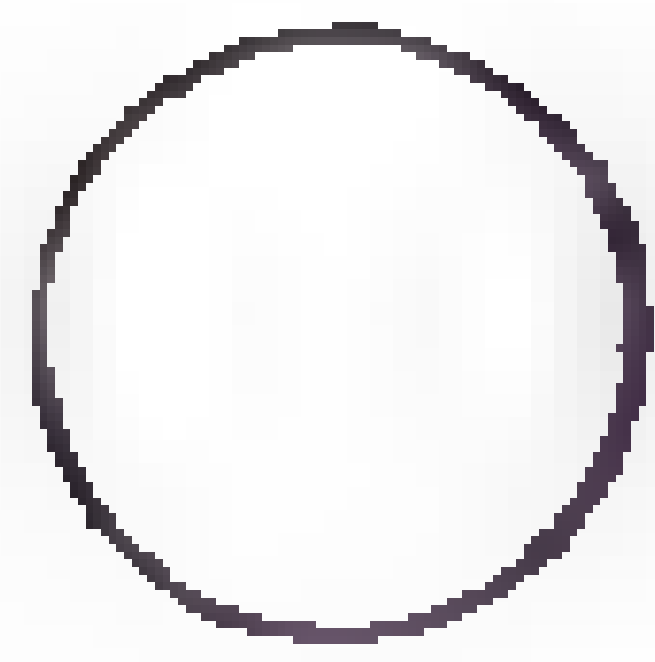
کسی صورت نمودِ زندگی کی راہ تو نکلے!
کوئی طوفاں ہی برپا کر اگر ساحل نہیں ملتا

تساہل باعثِ رسوائیٔ فکر و نظر بھی ہے
یہاں کل تھا وہاں اب جادۂ منزل نہیں ملتا

اگر توفیق ہو اک مرگِ با مقصد کی خواہش کر
دواؤں کے ذخیروں سے سکونِ دل نہیں ملتا

کہاں تک کام دیگا زیر و بم بے روح نغموں کا
حدی خواں سے مزاجِ ناقۂ محمل نہیں ملتا
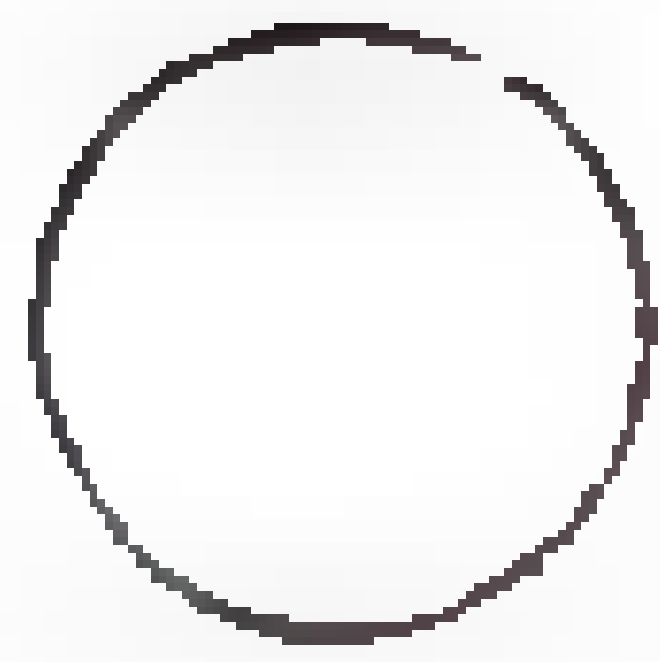
ہمت کو ہی جب سلسلہ جنباں نہیں دیکھا
پھیلا ہوا پھر عالمِ امکاں نہیں دیکھا

کیا پردہ دری اس سے ہو اسرارِ جنوں کی
چھو کر بھی کبھی جس نے گریباں نہیں دیکھا

مانگا کئے دنیا کے اندھیروں سے اجالا!
اور اپنا چراغِ تہِ داماں نہیں دیکھا

اے عصرِ رواں تیرا جہاں روشن و تاباں
سب کچھ یہاں دیکھا مگر انساں نہیں دیکھا

گاتا ہے حفیظ آج بھی آزاد ترانے
گستاخ نے شاید درِ زنداں نہیں دیکھا

○

ہم پھرے باندھے ہوئے سر سے کفن جیتے تھے ہیا
کجکلاہی کی بڑی کچھ نہ گھٹی تو نہیں بال

جھڑکیوں پر بھی نہ مایوس کرم ہوتے ہم
بیچ میں آ گیا ناموس گدائی کا سوال

آج بھی پھرتے ہیں آنکھوں میں وہ ماتھے کے نقوش
ہم سے میخانے کا دیکھا نہیں جاتا یہ حال

آ نہ جائے کوئی دھبہ ترے دامن پہ کہیں
شیخ خوش پوش گنہگاروں پہ کیچڑ نہ اچھال

کئی منزلیں تراشیں کئی کارواں بنائے
جو سفر کا نام آیا مرے پاؤں ڈگمگائے

وہ طلب بھی کیا طلب تھی وہ کشش بھی کیا کشش تھی
تری سمت یوں بڑھے ہم نہ خود اپنے ہاتھ آئے

کہیں کلفتوں کا رونا کہیں غفلتوں کا رونا!
کسی راستے میں کانٹے کسی راستے میں سائے

نہ اطاعتیں گذاریں نہ محبتیں نباہیں
نہ خدا کے کام آئے نہ بتوں کے کام آئے

وہی میری بیکسی پہ لگے ہنسنے دور ہٹ کر
جو وفا کا عہد کر کے مرے ساتھ ساتھ آئے

لو وہ بزمِ دوست میں بھی نہ نبھے حفیظ صاحب
کوئی ایسے نکتہ چیں کو بھلا کیسے منہ لگائے
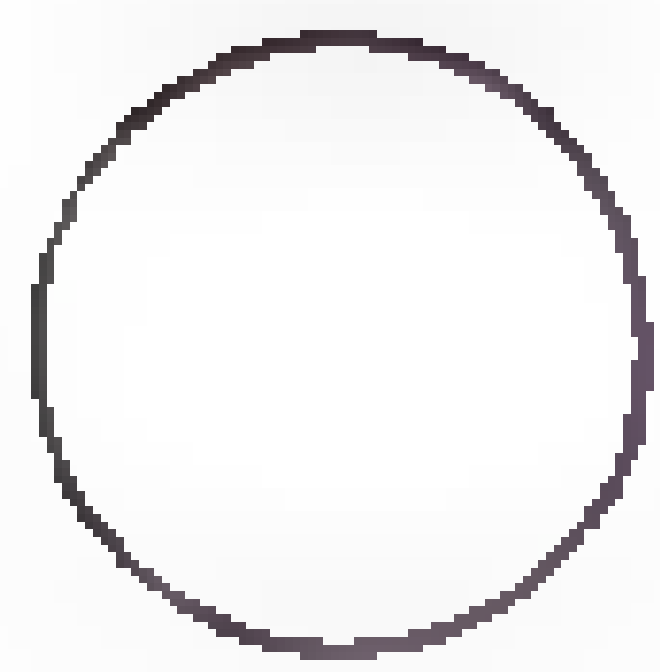
اثر کیا خاک ہوگا اسکی باتوں کا زمانے پر
جو خود اک مستقل تنقید ہو اپنے فسانے پر

کہاں کا ناخدا، کیسے سفینے، دست و بازو کیا
خدا ہی یاد آتا ہے سہارے ٹوٹ جانے پر

ہزاروں ٹھوکروں میں جستجوئے مرگ کرتے ہیں
وہ جن کو زندگی ملتی تھی تیرے آستانے پر

مسلسل نامرادی کا نتیجہ اور کیا ہوتا
محبت طنز بن کر رہ گئی آخر زمانے پر

معاف اے نو گرفتارو مرے پر نوچنے والے
مجھے مجبور کرتے تھے قفس کا در سجانے پر

میں کیوں اہل جہاں کی ترش روئی کا برا مانوں
گراں خوابی میں جھنجلایا ہی کرتے ہیں جگانے پر

○

یہی اک سبق دیا ہے مجھے مسلکِ وفا نے
کہ میں جاں کو جاں نہ سمجھوں جو ترا کہا نہ مانے

ترے عشق کے تقاضے کسے جائے بتانے
کہیں مستیوں کے حیلے کہیں ہوش کے بہانے

بھلی رہنمائیاں ہیں بھلی ناخدائیاں ہیں
وہی رخ قرار پایا جو بتا دیا ہوا نے

انھیں زینتِ چمن میں کوئی کیوں شمار کر لے
ابھی برق کے بھی قابل نہ ہوئے جو آشیانے

بایں انقلابِ ہردم، بایں ارتقائے پیہم
ترے نقشِ پا سے آگے نہ پہنچ سکے زمانے

انہیں غم کے موڑ پر بھی نہ ٹھہرنے دے مغنّی
حدِ نشّۂ طرب سے تو گذر گئے ترانے
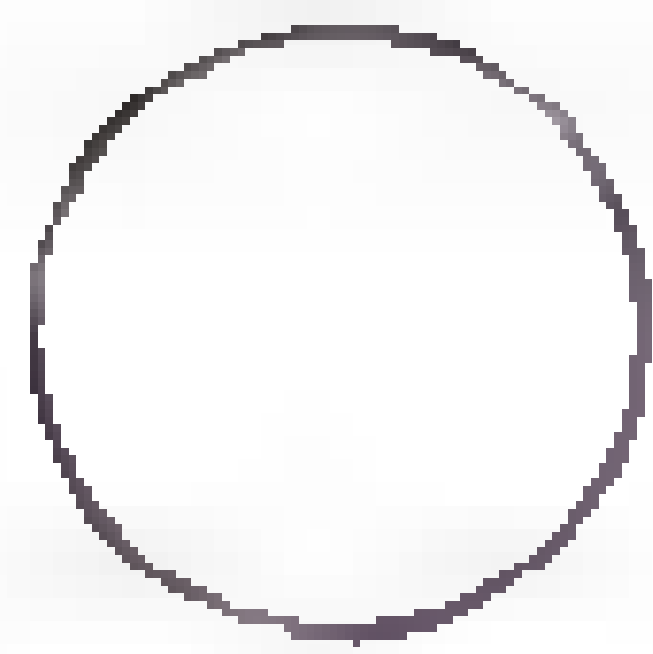
اس عزم میں عظمت کی کوئی بات نہیں ہے
جو عزم کہ پروردۂ آفات نہیں ہے

کچھ لوگ ہیں تشنہ تو کچھ جام بکف ہیں
ساقی ترے مے خانے میں مساوات نہیں ہے

اب کھل کے جو ہو بات تو کچھ بات بنے گی
یہ دورِ اشارات و کنایات نہیں ہے

عریانیٔ افکار و خیالات کا مطلب
عریانیٔ افکار و خیالات نہیں ہے

ہوتی ہے مقامِ سخن و دار سے حاصل
یہ زندہ دلی جنسِ خرابات نہیں ہے

ملتے ہی کچھ اس طرح امڈ آئے ہیں آنسو
جیسے کہ یہ رخصت ہے ملاقات نہیں ہے

جھک جھک کے حفیظؔ آپ نہ آداب بجا لائیں
یہ دادِ سخن ہے کوئی خیرات نہیں ہے
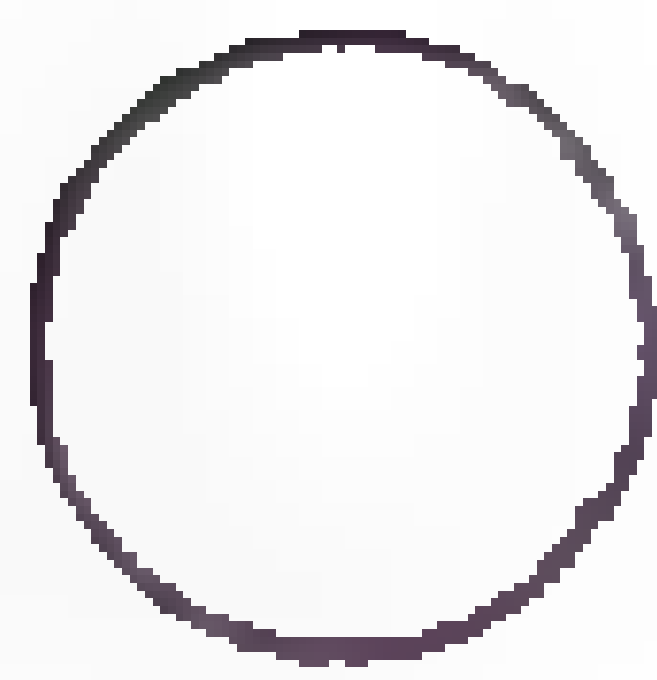
نہ جانے کتنے دل، کتنے جگر خوں ہو گئے ہوں گے
زبانوں پہ یونہی الفت کے افسانے نہیں آئے

گلوں سے داغ، کانٹوں سے خلش لینے کو آئے ہیں
گلستاں میں ہم اپنے دل کو بہلانے نہیں آئے

کبھی جب امتیازِ حق و باطل کا سوال آیا!
ہمارے سامنے پھر اپنے بیگانے نہیں آئے

ابھی کیا ہے کل اک اک بوند کو ترسے گا میخانہ
جو اہلِ ظرف کے ہاتھوں میں پیمانے نہیں آئے

جمودِ زندگی میں بے پیئے ہلنا بھی مشکل تھا
جہادِ زندگی میں یادِ میخانے نہیں آئے

گلے مجھ کو لگا کر وہ کسی کا ناز سے کہنا
حفیظِ بے وفا ہم تجھ اپنانے نہیں آئے

دار و رسن نے کس کو چنا دیکھتے ہیں!
یہ کون سربلند ہوا دیکھتے چلیں

آئے گا پھر چمن پہ تبسم کا وقت بھی
پہلے قفس کی آب و ہوا دیکھتے چلیں

اوروں کی لغزشوں ہی پہ رکھیے نہ بس نگاہ
اپنی طرف بھی راہ نما دیکھتے چلیں

پروانوں کا تو حشر جو ہونا تھا ہو چکا
گذری ہے رات شمع پہ کیا دیکھتے چلیں

جاتے تھے ہم تو پھیر کے منہ جلوہ گاہ سے
لیکن دل و نظر نے کہا دیکھتے چلیں

تہذیب نو کے عہد میں انسانیت کے ساتھ
انساں نے کیا سلوک کیا دیکھتے چلیں

اس انجمن میں عشق کہاں ہے ہوس کہاں
کس کس کو کیا مقام ملا دیکھتے چلیں

ہاں اک نظر حفیظ پہ عبرت کے واسطے
کیا رہ گئی ہے قدرِ وفا دیکھتے چلیں

نہیں ہوتیں کبھی ساحل کے ارمانوں سے وابستہ
ہماری کشتیاں رہتی ہیں طوفانوں سے وابستہ

کہیں مسلی ہوئی کلیاں کہیں روندے ہوئے غنچے
بہت سی داستانیں ہیں شبستانوں سے وابستہ

ہمارا ہی جگر ہے یہ، ہمارا ہی کلیجہ ہے
ہم اپنے زخم رکھتے ہیں نمکدانوں سے وابستہ

نہ لے چل خانقاہوں کی طرف شیخ حرم مجھ کو
مجاہد کا تو مستقبل ہے میدانوں سے وابستہ

ابھی یہ چلتے چلتے دیکھ لیتے ہیں خراشوں کو
ابھی کچھ اور زنجیریں ہیں دیوانوں سے وابستہ

میں یوں رہزن کے بدلے پاسباں پر وار کرتا ہوں
مرے گھر کی تباہی ہے نگہبانوں سے وابستہ

ہماری بے قراری کو نہ چھیڑو مطمئیں لوگو!
کہ تقدیر سکوں ہے ہم پریشانوں سے وابستہ

مورخ تیری رنگ آمیزیاں تو خوب ہیں لیکن
کہیں تاریخ ہو جائے نہ افسانوں سے وابستہ

محبت خامشی بھی، چیخ بھی، نغمہ بھی، نعرہ بھی،
یہ اک مضمون ہے کتنے ہی عنوانوں سے وابستہ

حفیظِ میرٹھی کو کون پہچانے کہ بیچارہ
نہ ایوانوں سے وابستہ نہ درباروں سے وابستہ

ان رہبرانِ قوم کی کیا پیروی کریں
جو رہبری کے نام پہ سوداگری کریں

نادان تو نہیں ہیں کہ یوں خودکشی کریں
ہم اور تیرے درد سے پہلو تہی کریں

ہر سمت ظلمتوں کے پرستار ہیں یہاں
شمعیں کدھر جلائیں کدھر روشنی کریں

دولت نے ہم سے ہاتھ ملایا تو ہے مگر
اس دشمنِ قرار سے کیا دوستی کریں

لے جبر آج فیصلہ کر کے اٹھیں گے ہم
جھک جائیں تیرے سامنے یا سرکشی کریں

مردانِ حق پرست کو ہر کربلا قبول
پیچیدہ مسئلہ ہو تو کچھ غور بھی کریں

خودداریوں کی جان بچانے کے واسطے
جی میں یہ آ رہی ہے کہیں خودکشی کریں

مانا کہ غم زدہ ہیں مگر بزم میں حفیظؔ
بالکل ہی چپ سادھ لیں کچھ بات بھی کریں
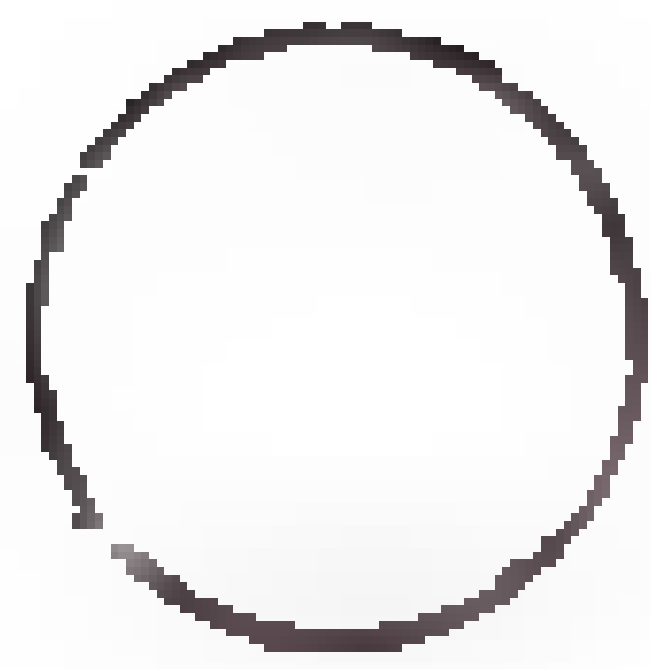
کوئی بھی پیش نہیں آتا مہرباں کی طرح
جہاں میں ہوں کسی ناخواندہ میہماں کی طرح

یہ بے نیاز سہارے نہ کام آئیں گے
ہمیں اٹھائے کوئی ناز دوستاں کی طرح

متاعِ آخرِ شب ہیں بچے کھچے تارے
بساطِ چرخ پڑی ہے لٹی دکاں کی طرح

یہ کس بہار بداماں چمن میں آگ لگی !
دہک رہا ہے دھواں زلفِ دلبراں کی طرح

ہیں اپنے دور کی روداد ہر بیت میں
سنا رہا ہوں محبت کی داستاں کی طرح

ہمارا جذبۂ تعمیر دیکھ لے دنیا
سجا رہے ہیں قفس کو بھی آشیاں کی طرح

کچھ اس ادا سے چمن کا شعور جاگا ہے
کلی کلی نظر آتی ہے باغباں کی طرح

سفر کے نام سے چیں بر جبیں رہے جو لوگ
وہ منزلوں پہ ملے میر کارواں کی طرح

کھنڈر میں ہو گیا تبدیل شاندار محل
حفیظ آپ کی مٹتی ہوئی زباں کی طرح
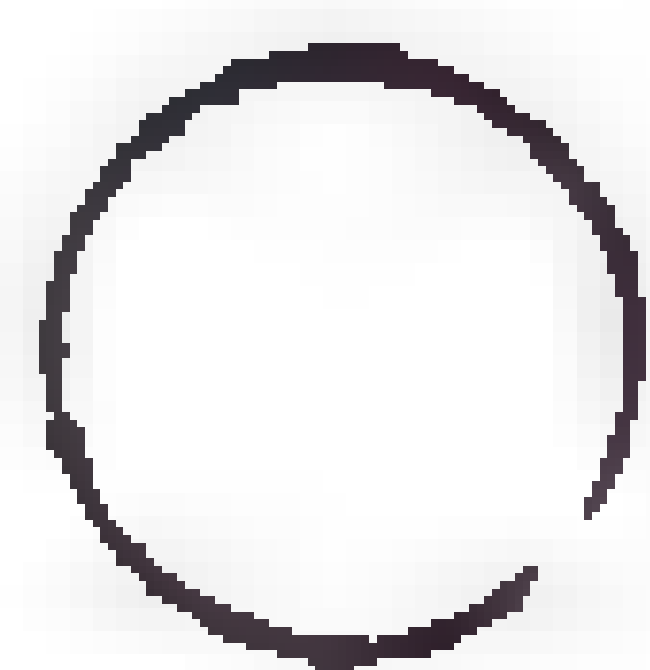
وہ بھی آزردہ نہ ہوں دل کی خلش بھی کم کریں
یعنی شکوہ تو کریں ان سے مگر مبہم کریں

عشق کی دنیا سے پیدا حسن کا عالم کریں
آہ کو نکہت بنائیں، اشک کو شبنم کریں

چاندنی کے ساتھ ہی تارے بھی رخصت ہو چلے
اس مناسب وقت پیمانِ وفا محکم کریں

پھر کریں تعریف ان کے منہ پہ انکے حسن کی
"بے وفا" کہہ کر یکا یک پھر انھیں برہم کریں

چل دیا جانے کدھر بستی کی سرحد سے حفیظؔ
ایسے آوارہ کا ناحق آپ اتنا غم کریں
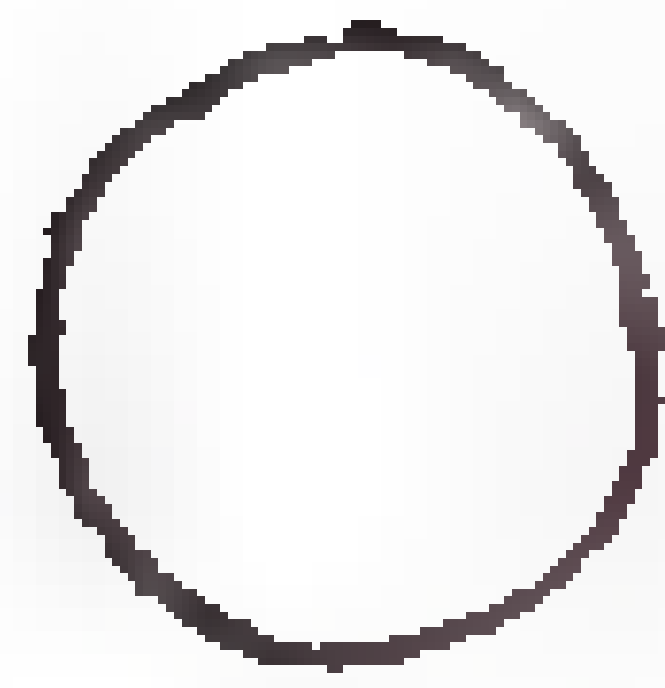
کیا جانے کیا سبب ہے کہ جی چاہتا ہے آج
روئے ہی جائیں سامنے تم کو بٹھا کے ہم

اب انتہائے ضبط نے دل میں لگا دی آگ
بیٹھے تھے آنسوؤں کی بغاوت دبا کے ہم

کیسا خیال، کس کی محبت، کہاں کا عشق!
یونہی بہک گئے تھے ترے پاس آ کے ہم

سچ ہے کبھی کی رات بڑی اور کبھی کے دن
جاتے ہیں تیرے ہاتھ سے دامن چھڑا کے ہم

یہ فلسفہ بھی ہے اور دل کا فیصلہ بھی ہے
سپردگی ہی نہیں عشق میں انا بھی ہے

اگرچہ درد کی شدت سے چیختا بھی ہے
تڑپنے والے میں جینے کا حوصلہ بھی ہے

نظر سے عہدِ وفا لے لیا ہے جلووں نے
ادھر حجاب سماں کا معاہدہ بھی ہے

کچھ اہتمام خصوصی کی فکر کر ساقی
کہ آج رندوں میں اک رند پارسا بھی ہے

زبانِ خلق کا یوں تو کچھ اعتبار نہیں
زبانِ خلق ہی نقارۂ خدا بھی ہے

سمجھ کے سوچ کے ہم کو خوش آمدید کہو
ہمارے ساتھ مسائل کا قافلہ بھی ہے

فقط زبان سے اقرار ہی نہیں کافی
سوال عہد وفا کے نباہ کا بھی ہے

نہ کارزارِ جہاں میں نہ خانقاہوں میں
جناب شیخ کہیں آپ کا پتہ بھی ہے

نیاز و ناز کی لذت حفیظؔ سے پوچھو
خدا شناس بھی ہے وہ خود آشنا بھی ہے

کھینچ کر بازار میں شہرت کے لے آیا مجھے
آہ میرا قدرداں بھی کب سمجھ پایا مجھے

جرم ہے جس پر ترس کھانا وہ دکھیارا ہوں میں
کیوں بلاتا ہے کسی دیوار کا سایہ مجھے

میں نے کس در پر عقیدت سے جبیں سائی نہ کی
کون سے در نے حقارت سے نہ ٹھکرایا مجھے

جرأتِ عرضِ تمنّا پر مسرت بھی ہوئی
ساتھ ہی خود داریوں پر رحم بھی آیا مجھے

یہ بھی کیا اے غمگسارو جیسے چھن جانے کو ہے
زندگی پر آج اتنا پیار کیوں آیا مجھے

چارہ سازی کی تو فرصت کس کو ہے لیکن حفیظ
دوستوں کا طرزِ دلجوئی پسند آیا مجھے